ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

ستمبر ۲۰۲۳ء

۱۵/روپئے

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

جناب وزیراعظم نریندر مودی مہاکمبھ کے ڈیجیٹل منصوبوں کاافتتاح کرتے ہوئے،
ریاست کی گورنر آنندی بین پٹیل اوروزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ بھی اپنے دیگروزراء کے ساتھ۔

جناب وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ڈاکٹر بی ایس کشواہا آیوروگیان سنستھان کانپور میں طلباء کو اسناد تفویض کرتے ہوئے۔

جلد:78 شمارہ:05

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

ستمبر ۲۰۲۳ء

سرپرست

جناب سنجے پرساد

پرنسپل سکریٹری، محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

پبلشر: ششر (ڈائرکٹر، انفارمیشن)

جناب انشمان ترپاٹھی (ایڈیشنل ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ایڈیٹر

ریحان عباس

رابطہ: 9838931772

Email:nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

نظارت: آسیہ خاتون، 9721856191

رابطہ برائے سرکولیشن و زرِ سالانہ:

صبا عرفی: 7705800953

تزئین کار: ایم. ایچ. ندوی

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ: ۱۸۰؍ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پنڈت دین دیال اُپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ،

اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Pleas send Cheque/Bank Draft in favour of Director,Information & Public Relations Department,Pandit Deendayal Upadhyay Soochna Parisar,UP,Lucknow

خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

اس شمارے میں...

اداریہ		
اپنی بات		۲
مضامین		
'مقدمۂ شعر و شاعری'	ڈاکٹر ایم عارف احمد	۳
غزل گائیکی پر ایک نظر	ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی	۶
امرت سر کے نامور فارسی شعراء	ڈاکٹر ریحان حسن	۹
اردو غزل میں گھر کی صورت اور صورت حال	ڈاکٹر عمیر منظر	۱۳
پیارے صاحب رشید کی رباعیوں میں مضامین پیری	مجتبیٰ حسن صدیقی	۱۶
افتخار عارف کی شاعری میں کربلا	عبدالقادر	۱۹
اکبرؔ الٰہ آبادی کی قومی و اصلاحی شاعری	الماس احمد انصاری	۲۲
منظومات		
غزل	خالد ندیم بدایونی	۵
غزل	محبوب خان اصغر	۱۵
غزل	سلیم سرفراز	۲۱
غزلیں	انس مسرورؔ انصاری/ ڈاکٹر رؤف خیر	۲۵
غزلیں	مصداق اعظمی/ معید رہبر	۲۶
غزل	جنیدؔ اکرم فاروقی	۳۱
افسانے		
سازش	انیس النبی	۲۷
راج نیتی گھرکی	عطیہ حسن	۳۰
ترقیات		
اتر پردیش صنعتی ترقیات سے روزگاری فروغ	نسرین فاطمہ	۳۲

ماہنامہ نیا دور، information.up.nic.in ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔

قیمت فی شمارہ: پندرہ روپے — سالانہ رکنیت فیس: ایک سو اسّی روپے

دو سال کی رکنیت فیس: تین سو ساٹھ روپے

تین سال کی رکنیت فیس: پانچ سو چالیس روپے

نوٹ: اپنی کمپوز شدہ تخلیقات، مندرج ای: میل آئی ڈی پر ہی ارسال کریں۔

E:mail:nayadaurmonthly@gmail.com

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

ماہنامہ نیا دور ستمبر ۲۰۲۳ء کا شمارہ حاضر ہے۔

اس برق رفتار عہد نے زندگی کی سہولتوں کی فراوانی میں ہماری سوچ سے زیادہ اضافہ کیا لیکن اس اضافہ نے ہماری ذاتی زندگی کے بہت سے اہم مشاغل ہم سے چھین لئے۔ عصر نو کے اس جدلیاتی انقلاب نے تو لوگوں کی آنکھوں سے نیندیں تک چرالیں۔ وہ زمانہ اورتھا جب سردی کی طویل راتیں دادی اور نانی کی اساطیری کہانیوں کی سرگوشیوں میں کٹ جاتی تھیں۔ افسانے، کہانیاں، شعروادب کی گرما گرم بحثیں اب ماضی کی داستان کا حصہ بنتی جارہی ہیں۔ کتاب پڑھنے کا شوق دم توڑتا سا نظر آرہا ہے۔ ظاہر سی بات ہے مطالعہ کے فقدان کی وجہ سے کتابوں اور رسائل وجرائد کی خریداری کی چمک دمک بھی ماند پڑتی جارہی ہے۔

بھارت میں ریاستی سطح پر بین الاقوامی کتب میلوں کے انعقاد کی اصل وجہ لوگوں میں کتابوں کی خریداری اور مطالعہ کے شوق کو مہمیز کرنے کے لئے ہی ہے۔ گزشتہ تین برس سے گومتی نگر ریورفرنٹ پر بھارت سرکار کی جانب سے نیشنل بک ٹرسٹ سوسائٹی کی طرف سے ایک شاندار کتب میلہ منعقد ہوا، جس میں دنیا کے ہر موضوع سے متعلق کتابیں موجود تھیں، سیاسیات، سماجیات، اقتصادیات، مذہبیات ادبیات، سیاحتیات، سیر وسلوک، تاریخ وتحقیق جیسے موضوعات پر دنیا کے بڑے رائٹرس، محققین، ادبا شعرا کے قلمی نگارشات کی خوب پذیرائی ہوئی۔

گومتی ریورفرنٹ کے کتاب میلے میں اس بار لکھنؤ والوں نے تو کمال کر دیا، علم وحکمت سے دلچسپی رکھنے والے افراد کی خاصی تعداد نے یہ بتا دیا کہ کتابوں کی خریداری اور اُس کے مطالعہ کا شوق کبھی نہیں ختم ہوسکتا۔

کتب میلہ کے انچارج سے اس بارے میں بات کی تو انہوں نے بتایا کہ اس کتب میلہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں بچوں کے لیے کریٹیو رائٹنگ، کہانی لکھنا، کامکس بنانے کے ساتھ نوجوانوں کے لیے کئی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر ایک مقابلہ جاتی اسٹیج بنایا جاتا ہے جس پر علم وادب پر مختلف موضوعات، زاویوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بحث ومباحثہ کیا جاتا ہے، لکھنؤ کی تاریخ، گنگا جمنی تہذیب پر گفتگو کی جاتی ہے۔ اس اسٹیج سے مقامی و بیرونی، بین اقوامی سطح کے آرٹسٹ پروگرام پیش کرتے ہیں۔ اس کتب میلہ میں قریب ایک ہزار سے زائد ملک سے پبلشرز آتے ہیں جن کے ۱۵۰ سے زیادہ اسٹال لگائے جاتے ہیں۔ اس کتب میلہ کے انچارج نے یہ بھی بتایا کہ لکھنؤ میں دوطرح کے ریڈرس گروپ ہیں۔ ایک انگلش اور دوسرا ہندی لٹریچر وارد ولٹریچر۔ لکھنؤ کے لوگ پریم چند نرالا، بھگوتی چرن ورما کے ساتھ شعروشاعری والی کتابیں خوب خریدتے ہیں۔ پبلشرز بتاتے ہیں کہ لکھنؤ کے لوگوں کا مطالعہ بہت وسیع ہے اس لئے وہ اچھی اچھی کتابوں کی خریداری اور اس کو مطالعہ کو اپنی ترجیحات کا حصہ گردانتے ہیں۔ لوگوں کی یہ گرم جوشی دیکھ کر مجھے یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ یہ صدی کتابوں سے عشق کرنے کی صدی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ماہنامہ نیا دور کے قارئین بھی کتابوں سے عشق کرنے والے ہراول میں اپنا نام مقدمتہ الجیش میں درج کرائیں گے۔

ریحان عباس

یہ شمارہ ستمبر ۲۰۲۳ء کا ہے جس کو دسمبر ۲۰۲۴ء میں شائع کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر ایم عارف احمد

کالی باغ، بتیا، بہار، انڈیا

7250283933

’مقدمۂ شعر و شاعری‘

مولانا الطاف حسین حالیؔ شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ نقاد بھی ہیں اور سوانح نگار بھی۔ واعظ بھی ہیں اور مصلح بھی۔ ناصح بھی ہیں اور حکیم بھی۔ وہ صرف مسدس ہی کے شاعر نہیں۔ انھوں نے اور بھی بہت سی نظمیں لکھی ہے۔ وہ غزل گو بھی ہیں اور اس کی فرسودگی کے سبب شاکی بھی ہیں۔ ان کے نثری کارنامے بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ ’حیاتِ سعدی‘، ’یادگار غالب‘ اور ’حیات جاوید‘ سوانح عمریاں بھی ہیں اور تنقید بھی۔ انھوں نے اردو تنقید نگاری میں باضابطہ ایک نئے دور کی ابتداء کی۔ اس لیے وہ اردو تنقید کے بانی ہیں۔ اصلاحی تحریک کے ایک اہم رکن بھی ہیں۔ اس طرح وہ ادب کے معلم ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ’مقدمۂ شعر و شاعری‘ لکھ کر اُردو شعر و ادب کے لیے باضابطہ نقد و نظر کی نئی راہیں استوار کی۔ بدلتے ہوئے حالات اور نت نئے تقاضوں اور رجحانات کے پیش نظر انہوں نے دانستہ طور پر کوشش کی۔ ان کی یہ کاوش فن و سخن کے میدان میں بہت بار آور ثابت ہوئی۔ یہ حالی تھے جنہوں نے شعر و ادب کو نئے تناظر اور نئے رجحانات سے آشنا کرایا۔ فرسودہ روایات سے بغاوت کرتے ہوئے شعر و شاعری کی دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کیا۔ جس کی وجہ سے ”مقدمۂ شعر و شاعری جدید تنقید کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔ اس لیے حالی اردو کے باقاعدہ نقاد اول قرار پائے اور ’مقدمۂ شعر و شاعری‘ اردو تنقید کی پہلی کتاب۔ اردو کے کم و بیش تمام ناقدین ادب اس بات سے متفق ہیں کہ اردو تنقید کی ابتداء حالی سے ہوتی ہے۔ لہٰذا مولوی عبدالحق فرماتے ہیں۔ ”صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں بلکہ اردو فن تنقید کا پہلا مقدمہ ہے‘۔ اختر حسین خان اعتراف کرتے ہیں۔ ’مقدمۂ شعر و شاعری‘ ہمارے ادب میں پہلی تنقیدی تصنیف ہے“۔ اور ڈاکٹر عبادت بریلوی یوں فرماتے ہیں۔ ”حالی اردو کے پہلے نقاد ہیں جنہوں نے ایک منظم اور مربوط شکل میں تنقیدی نظریات کو پیش کیا۔“ کسی نے کہا۔ ”مقدمہ شعر و شاعری“ اردو ادب میں سب سے پہلی اور اب تک اپنے موضوع پر آخری کتاب ہے۔“

حالی سے قبل تنقیدی شعور اردو ادب میں تھا ہی نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں تنقید کے اولین نقوش تذکرہ جات میں ملتے ہیں۔ میر تقی میر کی کتاب ’نکات الشعراء‘، فتح علی حسین گردیزی کی ’ریختہ گویاں‘، قدرت اللہ شوق کی ’چمنستان شعراء‘، میر حسن دہلوی کی ’تذکرہ شعرائے اردو‘، مرزا علی لطف کی ’گلشن ہند‘ محمد حسین آزاد کی آب حیات‘، مولانا عبدالسلام کی ’شعر الہند‘ تک تذکروں کا ایک سلسلہ زریں ہے۔ ان میں معیاری تنقید کا فقدان تھا۔ ان میں شاعر کی زندگی، شاعر کی شخصیت اور شاعر کے چند نمونہ کلام پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ ان تذکرہ نگاروں کا تنقید سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی ”حالی سے قبل بھی اردو میں تنقیدی شعور موجود تھا۔ لیکن اس کی حیثیت ادنیٰ درجہ کی تھی۔“ عبدالشکور فرماتے ہیں۔ ”حالی پہلے شخص تھے جنہوں نے اردو میں باقاعدہ تنقید کی طرف توجہ کی۔ ان سے پہلے تنقید اصل معنی میں نہ تھی۔“ پروفیسر عبدالمغنی کہتے ہیں۔ ”حالی کا مقدمہ شعر و شاعری تذکروں کی سوانحی و علمی یا فنی تنقید سے الگ اور آگے فکری تنقید کا ایک کارنامہ ہے۔ جس میں شاعری کے بنیادی تصورات سے اصولی بحث کی گئی ہے اور شعر و تنقید دونوں کا ایک نیا عہد نامہ ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔“

حالیؔ سے پہلے اردو میں باقاعدہ تنقید کا وجود نہیں تھا۔ حالی نے سب سے پہلے ان معیاروں اور اصولوں کو حلقہ تحریر میں لانے کی کوشش کی۔ انہوں نے شعر و ادب اور آرٹ کی ماہیت پر نظر ڈالی۔ نقد و نظر کے بنیادی اصول متعین کیے۔ ’مقدمۂ شعر و شاعری‘ اصل میں دیوانِ حالی کا مقدمہ ہے۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ حالی اس دور سے مختلف اپنی شاعری کے رنگ کا جواز پیش کر سکیں۔ یہی اردو میں اصول تنقید کا پہلا صحیفہ بھی قرار پایا۔ ’مقدمہ‘ کی اشاعت کے بعد ایسا نہیں ہے کہ ان کی باتوں کو جوں کا توں قبول کر لیا گیا۔ یہ نہ تو حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ اور نہ ہی الہامی کتاب ہے۔ ان کے خیالات سے اس دور میں اختلاف کیا گیا اور آج بھی اختلاف کیا جا رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے

> ”موضوعات کے اعتبار سے ’مقدمۂ شعر و شاعری‘ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں نظریاتی و اصولی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ جنہیں ہم نظریاتی تنقید کہتے ہیں اور دوسرے حصے میں غزل، قصیدہ اور مثنوی وغیرہ جیسی اصناف سخن کی عملی اور تجزیاتی تنقید ہے جسے عملی تنقید کہتے ہیں۔ حالی نے نظریاتی اور عملی تنقید دونوں کے نمونے پیش کیے ہیں۔ نظریات کی سطح پر اتنی مفصل اور فکر انگیز باتیں اردو ادب میں حالی سے پہلے نہیں ملتی ہیں۔ شعر و ادب کا زندگی سے کیا تعلق ہے؟ شاعری کی غرض و غایت کیا ہے؟ شعر کی اخلاق کے ساتھ کیا نسبت ہے؟ شاعر کا سماج کے ساتھ کیا ربط ہے اور بری شاعری کے کیا نتائج ہیں؟ شاعری میں افادیت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ شاعری میں مقصد کا کیا مقام ہے؟ شاعری کسے کہتے ہیں؟ ان کے عناصر ترکیبی کون کون سے ہیں؟ نیچرل شاعری سے کیا مراد ہے؟ غزل کے لیے کیا کیا شرطیں ضروری ہیں؟“

اس کی مخالفت کی۔ کچھ نے اظہار ناپسندیدگی کی۔ مگر کچھ لوگوں نے اسے اس قابل سمجھا کہ اس پر غور کیا جائے، کیوں کہ سیاسی دنیا کے انقلاب کے ساتھ ادبی دنیا میں بھی انقلاب آ رہا تھا۔ بلا شبہ یہ مقدمہ حالی کے نقطۂ نظر کی مقبولیت کے لیے راہیں ہموار کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔ اور اس سے اردو میں تنقید کی راہیں کھل گئیں۔

حالیؔ اردو ادب میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ادب اور زندگی کے باہمی رشتے پر غور کیا۔ وہ جس ماحول اور سماج میں زندگی گزار رہے تھے اس کی ضرورتوں کا جائزہ لیا۔ شعر و ادب کے آئینہ میں اس کی زبوں حالی کا مطالعہ کیا۔ پھر اصلاح کے لیے کمر بستہ ہوئے۔ اس عہد سے پہلے شاعر، نثار اور تذکرہ نگار لکیر کے فقیر تھے اور پرانی ڈگر پر چلتے آ رہے تھے۔ کسی کو روایت سے بغاوت کرنے کی جرأت نہ تھی۔ حالی اپنے نقطہ نظر میں حق بجانب تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کی اصلاح کے لیے براہ راست اقدام کیا اور 'مقدمۂ شعر و شاعری' لکھ کر سماجی تقاضوں کی روشنی میں اپنا نظریۂ شعر و ادب واضح کیا۔ اسی وضاحت پر ہماری تنقید کی عمارت کھڑی ہے۔ حالی کا یہ عظیم الشان کارنامہ اردو شاعری کی اس روایت پرستی پر ضرب کاری تھی جہاں کھو کھلے عشق و محبت، کردار و گفتار، لب و لہجہ، انداز و آداب سب زنانہ تھے۔ لفاظی، مبالغہ اور مریضانہ ذہنیت کی اشاعت کا سبب بنے ہوئے تھے، اور جس کے تباہ کن اثرات آئندہ نسل کو تباہی کی طرف لے جانے والے تھے۔ وہ مقدمۂ شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے اس طرز تحریر کو بھی فروغ دینا چاہتے تھے جو انقلاب آفریں اور اخلاق آموز تھا۔ چنانچہ انہوں نے اردو ادب کے دامن کو بہت کشادہ اور وسیع کر دیا۔ انہوں نے نئے نئے خیالات و مضامین کو جگہ دی۔ پرانی اور فرسودہ روش سے احتراز کیا۔ نئی نئی راہیں نکالی۔ حالی نے صرف عشق و عاشقی اور گل و بلبل کی کہانیوں پر اعتراض ہی نہیں کیا۔ بلکہ ان کے علاوہ فلسفہ و تصوف کو بھی شعر و ادب میں داخل کیا اور ساز حیات کو مقدمۂ شعر و شاعری میں چھیڑا۔

حالی مقدمہ میں افلاطون کے نظریہ سے متفق نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعری قوموں کے عروج و زوال کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس کو صالح خیالات پر مبنی ہونی چاہئے تا کہ وہ قوم اور سماج میں صالح افکار اور اعمال کا ذریعہ بن سکے۔ انھوں نے اپنے عہد تک کی اردو شاعری کے معائب کی نشان دہی نہیں کی بلکہ شعر و شاعری کے اصول و آئین سے بھی اردو دنیا کو متعارف کرایا اور اس فن کے بارے میں بنیادی سوال اٹھا کر ان کا حل بھی پیش کیا۔ ان کی نقادانہ برتری کا اعتراف اکثر و بیشتر نقادوں نے کیا ہے۔

''شعر و شاعری'' پر خواجہ الطاف حسین حالیؔ کا مقدمہ ان کے دیوان کے ساتھ پہلی دفعہ ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کسی طرح اسے ایک آزاد اور خود مختار تصنیف کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اور وہ برابر دیوان سے الگ شائع ہونے لگا۔ پڑھنے والوں نے بھی ہمیشہ اسے دیوان سے الگ کر کے ہی پڑھا۔ یہاں تک کہ بہت سے لوگوں کے لیے وہ دیوان کا مقدمہ نہیں تنقید کی ایک باقاعدہ کتاب ہے۔ اسے اس کے اصل مقصد یعنی مقدمۂ دیوان کی حیثیت سے دیکھا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا ناقدانہ پہلو ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ مقدمہ محض دیوان کا مقدمہ ہے اور اس کا مطالعہ اسی کی روشنی میں کرنا چاہئے۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ اتنے طویل مقدمہ میں مولانا حالی نے اپنی شاعری کا ذکر نہیں کیا اور نہ مثال میں اپنے وہ اشعار پیش کیے جنہیں وہ حقیقی شاعری خیال کرتے تھے۔ لیکن مطالعہ کرنے والے کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ حالی نے اپنے مزاج کی مناسبت سے اپنی شاعری کو مثال میں پیش کرنے سے گریز کیا ہے۔ مقدمہ کو دیوان کے ساتھ شائع کرنے میں ان کا مقصد یہی تھا کہ جب لوگ نفیس شاعری، شاعری میں اصلیت، سادگی اور جوش، نیچرل شاعری، اخلاق کے قائم مقام شاعری، نئی غزل، نئے قصیدے، نئے مرثیہ اور مثنوی کا مطالعہ کرنا چاہیں گے تو اس مقدمہ کو ختم کرنے کے بعد انھیں فوراً اس کے نمونے دیوان میں مل جائیں گے۔ اس دیوان میں حالی کے نقطہ نظر سے لکھی ہوئی غزلیں بھی ہیں۔ قصیدے، مرثیے اور مثنویاں بھی۔ اس میں وہ اخلاقی تصورات بھی ہیں جو حالی کو عزیز تھے۔ اس زبان کا استعمال بھی جو حالی کے خیال میں شاعری کے لیے مناسب تھی۔

موضوعات کے اعتبار سے 'مقدمۂ شعر و شاعری' کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں نظریاتی و اصولی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ جنہیں ہم نظریاتی تنقید کہتے ہیں اور دوسرے حصے میں غزل، قصیدہ اور مثنوی وغیرہ جیسی اصناف سخن کی عملی اور تجزیاتی تنقید ہے جسے عملی تنقید کہتے ہیں۔ حالی نے نظریاتی اور عملی تنقید دونوں کے نمونے پیش کیے ہیں۔ نظریات کی سطح پر اتنی مفصل اور فکر انگیز باتیں اردو ادب میں حالی سے پہلے نہیں ملتی ہیں۔ شعر و ادب کا زندگی سے کیا تعلق ہے؟ شاعری کی غرض و غایت کیا ہے؟ شعر کی اخلاق کے ساتھ کیا نسبت ہے؟ شاعر کا سماج کے ساتھ کیا ربط ہے اور بری شاعری کے کیا نتائج ہیں؟ شاعری میں افادیت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ شاعری میں مقصد کا کیا مقام ہے؟ شاعری کسے کہتے ہیں؟ ان کے عناصر ترکیبی کون کون سے ہیں؟ نیچرل شاعری سے کیا مراد ہے؟ غزل کے لیے کیا کیا شرطیں ضروری ہیں؟ شاعری اور زندگی کے باہمی ربط و ضبط کیا ہیں؟ شعر کی کیا کیا خوبیاں ہیں؟ شاعری کی اہمیت، اس کی ماہیت، اس کی ہیئت اور خصوصیات پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے اور مکالمے، ملٹن، کولرج اور ورجل وغیرہ کے حوالوں سے اپنے ادبی تصورات کو پیش کیا ہے۔ شاعری کا آئیڈیل قائم کیا اور مشرقی اور مغربی نقادوں کے شعر کے متعلق خیالات قلمبند کیے۔ اور پھر اردو دنیا کو پہلی بار یہ بتا کر چونکا دیا کہ شعر بغیر ردیف، قافیہ، بحر اور وزن کے بھی وجود میں آسکتا ہے۔ یہ اور اس طرح کی باتیں اردو تنقید میں پہلی بار حالی کی بدولت سامنے آئیں اور انہوں نے ان پر خاطر خواہ روشنی ڈالی۔ شعر کے لیے حالیؔ نے جو لازمی شرطیں مقرر کی ہیں وہ بھی کم اہمیت نہیں رکھتیں۔ تخیل، کائنات کا وسیع مطالعہ اور تفحص الفاظ تینوں اپنی اپنی جگہ قابل توجہ ہیں۔ شاعری کے تین اوصاف سادگی، اصلیت اور جوش پر بحث چھیڑ کر اور ان کی مناسب وضاحت کر کے حالی نے نقد شعر کے باب میں اپنی بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ نیچرل شاعری کے مقصد و مفہوم کو بھی واضح کیا ہے۔ نیز نظریاتی تنقید کے اصولوں کی روشنی میں بعض شعراء کے بارے میں اپنے تاثرات بھی مرتب کیے ہیں۔ مولانا حالیؔ وقت کی ضرورت کے تحت اصلاح شعر و ادب کا احساس رکھتے تھے اور اسی احساس کے تحت انھوں نے روایتی انداز سے بغاوت کر کے اردو ادب کی مختلف اصناف میں اپنے جدید اور مفید نظریات کے ذریعے ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ وہ شعر و شاعری کو سماج کے لیے ایک مفید اور کارآمد چیز سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں اس سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں۔

غالب کے شاگرد نے پہلی مرتبہ یہ بتانے کی کوشش کی کہ شعر و شاعری محض تفریحی امر نہیں بلکہ اس کا رشتہ سماج اور زندگی سے گہرا ہے۔ اس لیے وہ شعر کو تہذیب و اخلاق کا ایک عمدہ ذریعہ تصور کرتے تھے۔ شعر کی افادیت فرد کے لیے بھی ہے اور قوم کے لیے بھی۔ یہ ان دونوں میں وطن دوستی اور سرفروشی کے علاوہ ہمدردی، محبت، سلوک و رواداری اور دوسرے بہت سارے اوصاف پیدا کر سکتا ہے۔ شعر کے متعلق اپنے نظریہ پر وہ برابر کاربند رہے۔ حالی شعر و شاعری دونوں کی قدر و قیمت کے قائل ہیں کہ شعر کے اندر ہمارے احساس کو جگانے کی بے پناہ قوت چھپی ہوتی ہے۔ حالیؔ کی نظر میں ''وہی شاعری قابل قدر ہے جو سماجی برائیوں کو دور کرنے اور انسانی قدروں کو بلند کرنے میں معاون ہو۔ کیونکہ شاعری سے دنیا کے بڑے سے بڑے انقلاب کو تقویت ملتی ہے۔''

حالی نے 'مقدمۂ شعر و شاعری' کے دوسرے حصے میں عملی تنقید کے تحت غزل، قصیدہ اور مثنوی کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ غزل جیسی مقبول اور فرسودہ صنف سخن پر جب اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کرتے ہوئے نہایت ہی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ غزل کی کمزوریوں اور خامیوں کو بیان کیا اور

اس میں فکری وفنی اعتبار سے وسعت پیدا کرنے اور غیر صحت مند عناصر پر انگشت نمائی کی تو غزل کے شیدائیوں نے حالی کا قافیہ تنگ کرنے کی کوشش کی۔ وہ غزل کے مخالف نہیں تھے لیکن غزل میں جو گھٹیا پن پیدا ہوگیا تھا اس پر ان کا دل کڑھتا تھا۔ وہ اسے بھی اخلاق کا پابند دیکھنا چاہتے تھے۔ غزل کی سنجیدگی پر ان کا خاص زور تھا۔ وہ عشق کی پاکی و پاکیزگی پر زور دیتے ہیں۔ تقلید اور روایت پرستی کی وجہ سے مضامین کی بار بار تکرار نے شاعری کو بے مزہ کر دیا تھا۔ حالی کی کوشش سے غزل کا دائرہ وسیع ہوا اور زندگی کے ہر موضوع کو غزل میں سمو لیا گیا۔ چنانچہ حالیؔ نے غزل کو دربار حسن و عشق، گل و بلبل، محبوب کے ناز و انداز، اوصاف و خصائل، عادات و اطوار اور اس کی وفا اور بے وفائی کے دائرے سے باہر نکال کر کوچوں، بازاروں، دفتروں، تعلیم گاہوں اور عوام کے دلوں سے لے کر گھروں تک پہنچایا۔ شاعری اور زندگی دونوں کو ایک چیز بنا کر غزل کو ہماری زندگی کے لیے بہترین تجربات و محسوسات، بے چینی و بے قراری، مسائل حیات اور جذبات و احساسات و مشاہدات کا ترجمان بنایا۔

وہ صنف قصیدہ کو بے کار نہیں کہتے لیکن اصرار اس پر ہے کہ اس کے ذریعہ اچھوں کی خوبیاں بیان ہونی چاہئے اور بروں کے عیوب پر گرفت ہونی چاہیے جو لوگ واقعی تعریف کے مستحق نہیں ان کو قصیدہ کی مدح کا موضوع نہیں بنانا چاہیے۔ اس طرح موصوف نے مرثیہ میں بھی توسیع کی ضرورت محسوس کی کہ اسے موضوعات کربلا کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی استعمال کیا جانا چاہیے۔ نیز یہ کہ مرثیہ میں تصنع کی گنجائش نہیں۔ مرثیہ ہمارے درد و غم کے اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں جذبات کا بے ساختہ اظہار ضروری ہے۔

مولانا نے مثنوی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ قافیہ اور ترتیب اشعار وغیرہ کی پابندی نہ ہونے کے باعث مسلسل مضامین کے بیان کے لیے مثنوی سے بہتر کوئی دوسری صنف نہیں۔ ان کو اس بات پر رنج ہے کہ اس مفید صنف سے بھی کوئی بڑا کام نہیں لیا گیا اور محض عشقیہ داستانوں کو مثنوی کا موضوع بنایا گیا۔ اس میں حالیؔ وضاحت، مبالغہ آرائی سے اجتناب، مقتضائے حال کی پابندی، عادت اور مشاہدہ کے خلاف باتوں سے گریز جیسی خصوصیات دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ بے شرمی اور ناگفتنی باتوں کو صاف صاف کہنے کے بجائے اشارے کنایے میں ہی بیان کیا جانا چاہیے۔

مولانا الطاف حسین حالی کے 'مقدمۂ شعر و شاعری' نے شاعری کی دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا۔ اردو شاعری کے رخ کو موڑ کر شاعری کا آئیڈیل قائم کیا اور انہوں نے عرب، ایران، یونان، ہندوستان اور یوروپ کے مشہور و نامور شاعروں، ادیبوں اور نقادوں پر منصفانہ تنقید کی اور یہ بھی واضح کر دیا کہ قوموں کے عروج و زوال میں شاعروں کا بہت کچھ عمل دخل رہا ہے۔ یہ کتاب اب بھی اس موضوع کی ایک مستند دستاویز مانی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے قدیم طرز کے شعراء کے سامنے جدید طرز کا دروازہ کھل جاتا ہے اور دونوں طرز کی خوبیاں اور برائیاں اظہر من الشمس ہو جاتی ہیں۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'مقدمۂ شعر و شاعری' جیسا دستور العمل اردو ادب میں سب سے پہلی اور اب تک اپنے موضوع پر آخری کتاب ہے۔ یہ ایک عہد آفریں کارنامہ ہے۔ حالی اردو میں صرف تنقید کے بانی ہی نہیں بلکہ ترقی پسند تنقیدی فکر کے بانی بھی ہیں۔ انہوں نے عملی تنقید کی بنیاد رکھی اور تنقیدی فکر کو ایک نیا موڑ دیا۔ اس طرح 'مقدمۂ شعر و شاعری' ترقی پسند شعور کا آئینہ دار بھی ہے اور اردو تنقید کا سنگ میل بھی۔ تنقید جدید کا نقطہ آغاز بھی ہے اور اردو شاعری کا ضابطۂ حیات بھی۔ پرانے دور کی موت اور نئے دور کے باقاعدہ آغاز کا اعلان بھی ہے۔

❑❑❑

غزل

نظر کو نظر کی نظر ہوگئی ہے
دوا اِس لیے بے اثر ہو گئی ہے

جہاں بے خودی میں اضافہ ہوا ہے
محبّت وہی معتبر ہو گئی ہے

ابھی میرے خوابوں کی معراج ہوتی
کہا کس نے اُٹھو! سحر ہو گئی ہے

کوئی اور تدبیر تو ہی بتا دے
اگر اِلتجا میں کسر ہو گئی ہے

یقیناً تمہیں کچھ کہا ہے کسی نے
جبیں کیوں پسینے سے تر ہو گئی ہے

مری زندگی کا فسانہ نہ پوچھو
شبِ غم شریکِ سفر ہو گئی ہے

ابھی ہم نے گھر میں چراغاں کیا تھا
ہواؤں کو کیسے خبر ہو گئی ہے

خالد ندیم بدایونی
جامع مسجد شمشی۔ محلّہ ناگران شکیل روڈ بدایوں
9411420292

ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

6386231765

غزل گائیکی پر ایک نظر

اردو شاعری کا تصور غزل کے پیکر میں ڈھلا ہوا ہے اور سچ پوچھئے تو اردو کا نام آتے ہی دل و دماغ پر شعر و سخن رقص کرنے لگتا ہے۔

میرے مشاہدہ سے آپ یقیناً اتفاق کریں گے کہ جب بھی ہم نے اردو سے اپنی نسبت کا ذکر کیا تو فوراً شعر اور غزل سنانے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہم سب غزل کی ریشمی زنجیر کے اسیر ہیں۔ غزل خوانی اور غزل سماعی کیلئے شعور شرط نہیں ہے۔ اور تو اور تنہائی میں غزل پڑھ کر دیکھئے تو آپ کو اس حقیقت کا احساس بخوبی ہو جائے گا اور آپ دیکھیں گے کہ غزل پڑھنے کے ساتھ آپ گنگنا بھی رہے ہیں۔ اب اگر میں یہ کہوں تو آپ متفق ہوں گے کہ غزل گائیکی ہمارے مزاج و طبیعت اور کسی حد تک فطرت کا ایک لازمی جزو ہے۔

فطرت وہ بیج ہے جس کو درخت بننے تک مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ غزل گنگنانے کا تخمیہ رنگ غزل گائیکی کے شجر سایہ دار تک کیسے پہنچا؟ اس کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ابتداء سے شجر تک کے سفر میں ہر بیج کو نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غزل بھی اس دور سے گزری ہے۔ تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ کبھی اس کی گردن زدنی کی بات کہی گئی، کبھی اس کے عطر کو تعفن بتایا گیا تو کبھی اس مہذب صنف کو نیم وحشی کہا گیا۔ قدرت کے کارنامے بھی بالائے فہم ہوتے ہیں۔ کعبے کی پاسبانی صنم خانہ کرتا ہے۔ غزل اس معاملے میں بڑی خوش نصیب ہے اس کو حرم اور صنم دونوں سے پاسبان نصیب ہوئے ہیں۔ اس کو اردو شاعری کی آبرو قرار دینے والے میسر آئے تو وہیں حرم و صنم کی خوش رنگ، پرکشش، مترنم اور نغمگی سے سرشار آوازوں نے اس کو سماعت کی فضاؤں کا حکمراں بنا دیا۔

غزل جو کبھی تحت اللفظ اور ترنم سے سنائی جاتی تھی اب اس کا دائرہ بڑھ کر براہ راست موسیقی سے ہمکنار ہو گیا ہے۔ حالیہ منظر نامے میں یہ کہنا حق بجانب ہے کہ غزل کہنا جس طرح ایک معیاری فن ہے، غزل گانا بھی اسی معیار کا فن ہے چونکہ غزل عموماً کسی ایک خیال کی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ تصورات کا گلدستہ ہوتی ہے، لہٰذا گانے والے فنکار کو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ شاعری اور موسیقی کی ہم آہنگی قائم رہے، اس دور میں غزل کے طرز کو صرف راگ کے سروں تک ہی محدود رکھنا اس لئے مشکل ہو گیا ہے کہ راگ کا اپنا ایک موڈ ہوتا ہے اور غزل ایک گلدستہ جس کے ہر شعر کی ایک الگ خوشبو ہوتی ہے، اس کے باوجود چونکہ راگ ہمارا فن ہے، ہماری میراث ہے، اس لئے ہم اس کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتے۔ غزل گائیکی کے فن میں جو شگفتگی اور مجلسی چمکتی جگمگاہٹ ہے وہ کسی اور فن میں نہیں، اچھی غزل سن کر روح میں تازگی سی آجاتی ہے اور شوخ رنگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، سامع اور گلوکار کے درمیان ایک عجیب سا رشتہ اور ایک حسین تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ خواہ عارضی ہی سہی، آواز کے مدوجزر کے ذریعہ جذبات کی ترسیل بہت مشکل کام ہے، اس کے لئے گلوکار کو کلام میں پوری طرح ڈوب کر اس میں پوشیدہ احساسات کو سامع تک پہنچانا پڑتا ہے۔

ہندوستان میں غزل گانے کی روایت امیر خسرو نے قائم کی، صنف غزل اور ہندوستان کے فن سرود دونوں پر امیر خسروؔ کا سب سے گہرا اثر پڑا، خسروؔ ہی سے اس ارتقائی نیرنگیوں کا سلسلہ شروع ہوا جو وسطی ہندوستان کی موسیقی میں رونما ہوا، خسروؔ نے اکثر و بیشتر غزلیں گانے کے لئے کہی تھیں، چونکہ انھیں گایا گیا اس لئے عجمی اور ہندوستانی تہذیبی امتزاج سے غزل کا سابقہ ہندی لوک گیتوں سے پڑا جو غزل گائیکی کے مزاج میں رچ بس گیا۔ غزل گائیکی کے لئے اگر کوئی اصطلاح موزوں ہو سکتی ہے، تو وہ ہے: ''شعری موسیقی'' (کاویہ سنگیت) اس کا تعلق موسیقی اور شاعری دونوں سے یکساں ہے بلکہ شاعری کچھ زیادہ ہی اہم ہے اگر گائیکی میں شعر دب کر رہ جائے، اُس کے الفاظ صحیح انداز میں ادا نہ کئے جائیں یا طرز اور سروں کو اشعار میں مدغم کر دیا جائے تو اس کا لطف ختم ہو جاتا ہے، دیگر الفاظ میں کلاسیکی موسیقی میں کلا (فن) اہم ہے اور غزل گائیکی میں گلا (ادائیگی اور آواز)، کلاسیکی موسیقی کے مقابلہ میں یہ فن زیادہ تخلیقی ہے۔

> ''غالبؔ اور اصغرؔ کی بات پر غلام علی نے کان دھرے اور بتوں کا حسن اور شراب کی مستی کی کیفیات لے کر وہ ایوان غزل میں وارد ہوئے۔ اس حسین امتزاج اور خوبصورت آواز کے دھنی سے کون ہے جو متاثر نہیں ہوگا۔ ہندوستان میں ایک دور وہ بھی آیا جب غزل گائیکی ملک کی سرحدوں کو توڑ کر بیرون ملک میں رو او رائج ہوئی اور اس کے افق پر ایک نام جگجیت سنگھ کا ہوا۔ جگجیت نے مغربی سازوں اور غیر روایتی تال کا استعمال غزل میں پہلی بار کیا ہے۔ اپنی بیوی چترا کے ساتھ ''جُگل بندی'' کے انداز میں غزل گانے کی ابتدا بھی اُن ہی کی دین ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ مہدی حسن کی غزلیں گاتے تھے لیکن بہت جلد انھوں نے اپنی الگ پہچان بنالی۔ اب جگجیت سنگھ 'جگ جیت' چکے ہیں۔ ان کے گائے ہوئے شہ پارے ''سرکتی جائے ہے رخ سے نقاب آہستہ آہستہ'' اور ''بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی'' ہر دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔''

موجودہ دور کی غزل گائیکی جس کے پیش رو بیگم اختر، مہدی حسن، غلام علی وغیرہ ہیں وہ نیم کلاسیکی موسیقی ہے۔ ان فنکاروں کی گائی ہوئی غزلوں میں راگ کا پورا مزہ ملتا ہے اور اکثر غزلوں میں اُس راگ کی حلاوت بھی قائم رہتی ہے جس پر وہ مبنی ہے۔ غزل گائیکی میں ایسے مقبول راگوں کا استعمال کیا جاتا ہے کہ جن میں گاتے وقت ہر طرح کے جذبات کا اظہار کرنے میں گائیک کو سہولت رہے، ان راگوں میں بھرویں، کافی، کھماج، پہاڑی اور پیلو شامل ہیں، اکثر غزلیں چھ، سات یا آٹھ ماترے کے تال میں بٹھائی جاتی ہیں جنھیں بالترتیب دادر، روپک اور کہروا کہا جاتا ہے، آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی غزلیں گانے میں سات ماترے کے تال (روپک) کا استعمال اس قدر عام تھا کہ روپک تال کی ایک شکل ''مغلئی'' وجود میں آئی جواب بھی اسی طرز کی غزلیں گانے میں استعمال ہوتی ہے۔

کلاسیکل موسیقی میں بندھی ہوئی دھن کو بندش کہتے ہیں جو کسی مخصوص راگ اور تال میں ترتیب دی جاتی ہے، بندش کا پہلا حصہ استھائی اور دوسرا انترہ کہلاتا ہے، غزل گائیکی میں مطلع استھائی کے طور پہ استعمال ہوتا ہے اور باقی اشعار انترے کے طور پر گائے جاتے ہیں، اس ترتیب سے گانے والے کو آسانی اور سہولت رہتی ہے۔

تاریخ میں جن غزل گانے والوں کا سراغ ملتا ہے ان میں مہر افروز اور نصرت خاتون سب سے پہلی ہیں، یہ دونوں خواتین خلجی دربار میں امیر خسرو کی غزلیں گایا کرتی تھیں، خلجی سلطان علاء الدین کے بیس سالہ دور میں ان دونوں خاتون گائیکوں کا شہرہ تھا۔ غزل کو ہندوستانی سنگیت کی ایک صنف کے طور پر انیسویں صدی میں تسلیم کیا گیا۔ اس کا ایک اہم سبب ''پارسی تھیئٹر'' کا قیام ہے۔ پارسی برادری نے برصغیر میں بیس سے زیادہ ڈرامہ کمپنیاں بنائیں، پارسی تھیئٹر کی مقبولیت نے غزل گائیکی کو بھی مقبول عام بنایا۔ اسی مقبولیت نے تھیئٹر کی دنیا میں استحکام اور ترقی کے اگلے قدم 'سنیما' میں اسے مرکزی اہمیت بخشی۔

روز روشن کی طرح یہ بھی روشن ہے کہ غزل گائیکی کو فروغ دینے میں ہندوستانی فلموں کا ایک اہم رول رہا ہے۔ ہندوستان کی پہلی خاموش فلم 'راجہ ہریش چندر' تھی جس کے ہدایت کار دادا صاحب پھالکے تھے، جو ۱۹۱۹ء میں بنی، اسکے بعد ۱۹۲۲ء میں ''لیلیٰ مجنوں''، ۱۹۲۳ء میں ''نور جہاں''، ۱۹۲۴ء میں ''رضیہ بیگم''، ۱۹۲۸ء میں ''انارکلی''، ۱۹۲۹ء میں ''شیراز'' ریلیز ہوئی۔ اس فلم کو بین الاقوامی شہرت اور اہمیت بھی نصیب ہوئی۔ فلموں کی تاریخ میں خاموشی توڑ کر بولنے کا سلسلہ ۱۴ رمارچ ۱۹۳۱ء سے شروع ہوا۔ ہندوستان کی پہلی متکلم فلم اردیشر ایرانی کی ''عالم آرا'' ہے جو اپنے فلمی مواد میں مسلم کلچر کی ترجمانی کرتی ہے۔ 'عالم آرا' کے نغموں سے غزل کا جو رشتہ استوار ہوا وہ آج بھی کسی نہ کسی رنگ میں برقرار ہے۔

غزل گائیکی اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے جب فلم انڈسٹری کے پردے پر پہنچی تو جہاں کیمروں کی آنکھوں نے اس کے روپ اور بہروپ کو نکھارا وہیں آنکھوں کو حیرت تو کانوں کو نغموں کے رس سے بھی نوازا۔ فلموں کی مقبولیت نے اردو غزل کو ہر خاص و عام تک پہنچا دیا۔ جب فلموں کی مقبولیت نے گھر سے باہر قدم نکالا تو اردو غزل نے بھی سرحدیں پار کیں اور گائیکی کے آسمان نے اسے نئے آفاق کی راہیں دکھائیں۔ ودیسی شہرت نے نغمہ نگاروں اور گلوکاروں کے وقار میں چار چاند لگائے اور اعزاز، اکرام و انعام سے نوازے جانے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ اب تک کیفی اعظمی، اختر الایمان، راجندر سنگھ بیدی، شہریار، جذبی، ندا فاضلی اور سریندر پرکاش وغیرہ کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے نغمہ نگار پدم شری اور پدم بھوشن سے بھی سرفراز کئے جاچکے ہیں، جوش، ساحر، علی سردار جعفری، جاوید اختر وغیرہ بھی اس طویل فہرست کا حصہ ہیں۔ فراق، علی سردار جعفری، شہریار اور گلزار گیان پیٹھ ایوارڈ کا اعزاز بھی حاصل کر چکے ہیں۔

گائیکی کی تاریخ کو شاہان اودھ کی خدمات کی روشنی میں دیکھیں تو واجد علی شاہ اختؔر کا نام جلی حروف میں نظر آتا ہے۔ واجد علی شاہ صوبۂ اودھ کے دسویں اور آخری تاجدار تھے۔ وہ فنون لطیفہ کے سرپرست ہونے کے ساتھ ساتھ خود ایک شاعر، ڈرامہ نگار، میر رقص اور ماہر رقاص تھے، انہوں نے اختر پیا کے قلمی نام سے دو شعری مجموعے: ''حسن اختر'' اور ''دیوان اختر'' لکھے، اودھ اور ہندوستان کے بعض دیگر علاقوں میں ان کی غزلیں بہت مقبول تھیں، واجد علی شاہ کتھک رقص میں بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے، شاہ نے کتھک میں غزل کو شامل کر کے کتھک کو ترقیوں کی نئی راہ دکھائیں۔ واجد علی شاہ کا پری خانہ راجہ اندر کی سبھا کا ایک زندہ عکس تھا جہاں تقریباً ہر روز و شب محفل رِقص و سرود برپا ہوتی تھیں۔ اس محفل میں جان عالم پیا اختؔر کی تخلیق کردہ غزلیں اور ٹھمریاں گائی جاتی تھیں۔ واجد علی شاہ نے موسیقی کی پانچ کتابیں 'صوت المبارک'، بنی، ناجو، چنچل اور ناز نین' تصنیف کی ہیں۔ ان کتابوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر کتب موسیقی کی دانش گاہوں کے نصاب کا حصہ ہیں۔ اودھ میں غزل گائیکی کے ابتدائی نقوش شجاع الدولہ کے عہد سے ملتے ہیں لیکن اس کا رنگ عوامی نہیں درباری ہے۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر کے دور میں یہ ترقی کرتی ہے اور واجد علی شاہ کے اقتدار میں بام عروج پر پہنچتی ہے۔ واجد علی شاہ کے دور میں درباری کے ساتھ کچھ کچھ عوامی رنگ بھی جھلکنے لگا تھا۔ غزل گائیکی کے ابتدائی نقش و نگار کی تلاش بغیر لکھنؤ کے بار یاب نہیں ہوسکتی۔

غزل گائیکی پہلے کوٹھوں اور گانے والیوں سے وابستہ تھی، موسیقی کی دنیا میں یہ اپنے لئے وہ باوقار مقام نہ بنا سکی تھی، جو بہت پہلے اسے حاصل تھا اور خانقاہوں سے درباروں تک اس کی پذیرائی ہوتی تھی، حاکمان وقت اس کی قدر کرتے تھے اور محفلوں کی جان سمجھتے تھے، جب یہ دربار سے بازار پہنچی تو گلی کوچوں میں کھوگئی اور یہ راستے کی دھول بن کر رہ گئی۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آس پاس اس کو اپنا کھویا ہوا وقار واپس ملنا شروع ہوا، ۱۹۳۸ء میں استاد برکت علی خان (استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے برادر خورد) نے ٹھمری کے ساتھ غزل بھی گانا شروع کی اور ان کی گائی ہوئی غزلوں کی دھوم مچ گئی۔ وہ اپنے دور کے دھرندر گوئیے تھے، آواز باریک، لیکن دلکش اور نہایت سریلی تھی، آج بھی ان کی غزلوں کے کچھ ریکارڈ اور ٹیپ موجود ہیں۔ پٹیالہ گھرانے کے اس استاد نے بڑے غلام علی خان کی طرح شہرت تو حاصل نہ کی لیکن ٹھمری اور غزل کو ایک نئے آہنگ سے روشناس ضرور کیا۔

غزل گائیکی کو بازار سے ڈرائنگ روم تک پہنچانے میں مرحوم کندن لال سہگل کا نمایاں حصہ رہا ہے، سہگل صاحب محفل میں کبھی کامیاب نہیں ہوئے لیکن ان کی آواز نے مائکروفون سے گراموفون ریکارڈ تک پہنچنے میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا انداز دیا، اس انداز میں بنگال کی سادگی، پنجاب کی رنگینی اور اودھ کی دل کشی کا امتزاج تھا۔ سہگل کے بعد جو بڑا نام غزل گائیکی میں آیا وہ بیگم اختر کا ہے، بیگم اختر جب تک اختری بائی فیض آبادی کے نام سے گاتی رہیں ان کی گائیکی میں سطحیت اور شوخی کا عنصر رہا لیکن زندگی کے دوسرے دور میں بیگم اختر کی گائیکی میں ایک عجیب موڑ آیا اور ان کی گائیکی کا باہری روپ سادہ اور داخلی رنگ زیادہ گہرا ہوتا گیا۔

اسی دوران طلعت محمود کا ستارہ بلند ہوا۔ ان کا تعلق لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ طلعت محمود نے غزل گائیکی میں شہرت حاصل کی۔ ابتدا ہی سے طلعت محمود غزل گائیکی کی طرف مائل تھے۔ ایک زمانہ میں غزل کا ذکر آتے ہی طلعت محمود کا نام ذہن میں آجاتا تھا۔ وہ اپنے دور کے روایت ساز فنکار تصور کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنا ایک الگ انداز پیش کیا اور عوام نے اسے خوب پسند کیا۔ ان کی آواز کی ہلکی لرزش ان کی پہچان بن گئی۔ طلعت کی غزلیں سننا فیشن میں شامل ہوگیا اور ان کے گراموفون ریکارڈ رکھنا خوش ذوقی کا پیمانہ تھا۔ اُن کی گائی ہوئی غزلیں، ریڈیو اور گراموفون

کے ذریعہ ملک کے گوشے گوشے میں گونجنے لگیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ طلعت اپنے دور کے مقبول ترین غزل سرا ہیں اور آج بھی وہ ایک مخصوص حلقہ ان کا مداح ہے۔

طلعت کی گائی ہوئی یہ غزلیں بھلا کون فراموش کرسکتا ہے:

بے کیف دل ہے اور جئے جا رہا ہوں میں
چند لمحے تری محفل میں گزار آیا ہوں میں
غم زندگی کا یارب نہ ملا کوئی کنارا
کبھی شاخ وسبزہ و برگ پر
کون کہتا ہے تجھے میں نے بھلا رکھا ہے
ہونٹوں سے گلفشاں ہے وہ، آنکھوں سے اشکبار ہیں ہم

آج سننے والوں کا مزاج بدل گیا ہے، لیکن طلعت کی لطیف اور شیریں آواز کانوں میں رس گھولنے کی قدرت رکھتی ہے۔ ان کو سن کر آج بھی اہل ذوق محسوس کریں گے کہ جیسے وہ کسی خوابناک جزیرہ میں ہیں جو سمندر کے درمیان اپنے تنہا وجود کو قائم رکھے ہوئے ہے اور جہاں خوش گلو پرندے نغمہ سرائی کررہے ہیں۔ غزل گائیکی کی دنیا کا ایک بڑا نام محمد رفیع ہے جو آج بھی کروڑوں دلوں کی دھڑکن ہے۔ محمد رفیع نے اپنے طویل کیریئر میں تقریباً ۷۰۰ فلموں کے لئے ۲۶ ہزار سے زائد گانے اور غزلیں گائی ہیں۔ بڑے مزے کی بات ہے کہ رفیع کو گانے کی تحریک ایک فقیر سے ملی جس کے خوش گلو نغمے اور غزلیں سنتے اور گنگناتے ہوئے وہ خود گلوکار بن گئے۔ ظاہر ہے کہ ان کے گائے ہوئے گانوں کی فہرست نہیں دی جاسکتی البتہ یاد تازہ کرنے کے لئے کچھ مقبول فلموں کی طرف اشارہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔ ''انداز''، ''دیدار''، ''کاغذ کے پھول''، ''نیا دور''، ''مغل اعظم''، ''تاج محل''، ''لیلیٰ مجنوں''، ''میرے محبوب''، ''سنگم''، ''چائنا ٹاؤن''، ''تیسری منزل''، ''پاکیزہ''، ''دوستانہ''، ''کشمیر کی کلی'' جیسی سینکڑوں مشہور فلموں میں اپنی غزل گائیکی اور نغمہ سرائی کے جوہر دکھائے۔ انکی گائی ہوئی یادگار غزلوں اور گیتوں میں ''تعریف کروں کیا اسکی''، ''یہ ریشمی زلفیں''، ''زندہ باد زندہ باد اے محبت''، ''یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں''، ''بہاروں پھول برساؤ''، ''یہ چاند سا روشن چہرہ''، ''میرے پیار کی آواز پہ چلی آنا''، ''سہانی رات ڈھل چکی''، ''خوش رہے تو سدا''، ''باغوں میں بہار ہے''، ''کس قدر بے رخی سے ملتے ہیں''، ''اک حرف آرزو پہ خطا کار ہم ہوئے''، ''سکون دل کا کوئی راستہ نہیں ملتا''، ''غم بھی تنہا ہے اور خوشی تنہا''، ''یقیں کیسے کیسے گماں کیسے کیسے''، ''اگر بے وفا تجھ کو پہچان جاتے'' وغیرہ کے نام کس حافظے کی زینت نہیں ہیں۔

ادھر پہلو یعنی پڑوس میں کچھ اہم غزل سرا دلوں کی دھڑکن بنے ہیں۔ ان میں مہدی حسن، غلام علی اور فریدہ خانم کے نام سرفہرست ہیں۔ غزل گائیکی کو نئے رنگ وآہنگ میں توانا بنانے کا سہرا مہدی حسن کے سر ہے۔ اگر ان کو غزل گائیکی کا مسیحا کہا جائے تو میرے خیال میں ایک موزوں اعزاز ہوگا۔ مہدی حسن کی غزل گائیکی قدیم وجدید کا نہایت حسین امتزاج ہے۔ غلام علی غزل گائیکی کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ وہ اپنی فنکارانہ مہارت اور دل کش انداز سے بہت جلد مقبولیت کے آسمان پر پہنچ گئے ہیں۔ غالبؔ نے کہا ہے کہ موسیقی کے بغیر غزل ایسی ہی ہے جیسے شراب کے بغیر ساغر۔ اصغر گونڈوی نے غزل کی خوبی یوں بیان کی ہے۔

اصغرؔ غزل میں چاہیے وہ موج زندگی
جو حسن ہے بتوں میں، جو مستی شراب میں

غالبؔ اور اصغرؔ کی بات پر غلام علی نے کان دھرے اور بتوں کا حسن اور شراب کی مستی کی کیفیات لے کر وہ ایوان غزل میں وارد ہوئے۔ اس حسین امتزاج اور خوبصورت آواز کے دھنی سے کون ہے جو متاثر نہیں ہوگا۔

ہندوستان میں ایک دور وہ بھی آیا جب غزل گائیکی ملک کی سرحدوں کو توڑ کر بیرون ملک میں رواو رائج ہوئی اور اس کے افق پر ایک نام جگجیت سنگھ کا ہوا۔ جگجیت نے مغربی سازوں اور غیر روایتی تال کا استعمال غزل میں پہلی بار کیا ہے۔ اپنی بیوی چترا کے ساتھ ''جگل بندی'' کے انداز میں غزل گانے کی ابتدا بھی اُن ہی کی دین ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ مہدی حسن کی غزلیں گاتے تھے لیکن بہت جلد انھوں نے اپنی الگ پہچان بنالی۔ اب جگجیت سنگھ 'جگ جیت' چکے ہیں۔ ان کے گائے ہوئے شہ پارے ''سرکتی جائے ہے رخ سے نقاب آہستہ آہستہ' اور ''بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی'' ہر دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔

غزل گائیکوں کی جس دوسری جوڑی نے مقبولیت حاصل کی وہ راجندر مہتا اور نینا مہتا کی جوڑی ہے۔ ان کی گائیکی کا لطیف، سلجھا نغمگی میں ڈوبا ہوا انداز سب سے جدا ہے۔ راجندر مہتا ایک تجربہ کار فنکار ہیں ان کی گائیکی کا انداز طلعت محمود کی طرح ہلکا پھلکا ہے۔ جس میں گیتوں کی مٹھاس بھری ہے، وہ جذبہ میں ڈوب کر گاتے ہیں اور نینا بھی اسی رنگ میں ساتھ دیتی ہیں۔ کچھ ایسے بھی فن کار دیکھنے میں آئے ہیں جو بہت جلد چمکے اور غروب بھی ہوگئے۔ ان میں سدہا ملہوترا اور جگجیت کور کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ملہوترا نے خانہ آبادی کے بعد گانے بجانے کو ویران کردیا اور یہی کچھ حال جگجیت کور کا بھی ہوا۔ ہم افسوس اور ان کی واپسی کی امید ہی کرسکتے ہیں۔ یونس ملک ایک نہایت ہی باصلاحیت فنکار ہیں وہ خود بھی غزل گاتے ہیں اور دوسرے گلوکاروں کے لئے بھی غزلوں کی نہایت دل کش طرزیں بناتے ہیں۔ اُن کے کئی شاگرد غزل گائیکی میں نام پیدا کررہے ہیں۔ ان کو دھنیں بنانے میں کمال حاصل ہے۔ یونس ملک کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ غیر مانوس تال بھی استعمال کرلیتے ہیں۔ غالب صدی کے موقع پر خیام کا جو ریکارڈ ریلیز ہوا ہے اس کی طرزیں یونس ملک ہی نے بنائی ہیں۔ غزل گائیکی میں ابھرتے ہوئے ناموں میں سب سے اہم نام راجکمار رضوی کا ہے وہ مہدی حسن کے عزیز بھی ہیں اور غائبانہ شاگرد بھی۔ ان کی منجھی ہوئی سریلی آواز اور سر لگانے کا حسین انداز سامع کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ راجکمار رضوی کا تعلق راجستھان کے کلاونت گھرانے سے ہے۔

مذکورہ فنکاروں کے علاوہ بھی بہت سے فنکار ہیں جو اپنے حلقوں اور علاقوں میں افادیت و انفرادیت کے حامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ مختصر سے مضمون میں سب کا ذکر نہیں کیا جاسکتا لیکن مشتے نمونے از خروارے کے طور پر کچھ نام ضرور گنائے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ہری ہرن، اشوک کھوسلہ، سریش واڈ کر، صلاح الدین، سعادت بن اشرف، خالد، انور، سرلا کپور، بلونت بنسل، اسلم خان، جگدیش ٹھاکر، وجے چودھری، رینو چودھری، انورادھا، سمتر الہری، مہندر چوپڑا، دلراج کور، مبارک بیگم، مہیش چندر، کنول سدھو، چندن، چاند رائے، نصرت فتح علی خان، راحت فتح علی خان، طلعت عزیز، جاوید اختر، چترا سنگھ، ثریا رحمان وغیرہ۔

غزل مضمون آفرینی اور معنی آفرینی کی وجہ سے درباروں میں کرسی نشیں اور دل نشین تھی۔ ترنم اور خوش گلو کی آمیزش نے ہر طبقہ کے درمیان اس کو باریاب کیا اور اب موسیقی کے امتزاج نے اس میں ایک نیا انقلاب برپا کردیا ہے۔ غزل گائیکی تہذیب کے ساتھ بازار اور کاروبار کی ایک جنس گراں بھی بن گئی ہے۔ شہرت اور روزگار کے بغل گیر ہونے سے غزل گائیکی میں مستقبل کی وہ راہیں روشن ہوگئی ہیں جس سے غزل گائیکی کا مستقبل بھی روشن نظر آرہا ہے۔

حوالہ جات

(۱) اخترؔ انصاری، غزل اور درس غزل، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۷۷ء، ص: ۱۰۔
(۲) ڈاکٹر کامل قریشی، اردو غزل، ثمر آفسیٹ پریس، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۳۔
(۳) متین الرحمن، غزل گائیکی کے بدلتے رنگ، پاشا پریس، بھوپال، جنوری ۱۹۸۲ء۔
(۴) انجم شیرازی، غزل گائیکی، سانجھ پبلیکیشنز، لاہور، جولائی ۲۰۱۳ء۔
(۵) ڈاکٹر امام اعظم، ہندوستانی فلمیں اور اردو، نیو پرنٹ سینٹر، دریا گنج نئی دہلی، ۲۰۱۲ء۔

□□□

ڈاکٹر ریحان حسن

شعبہ اردو وفارسی، گورونانک دیو یونیورسٹی، امرت سر (پنجاب)

8559020015

امرت سر کے نامور فارسی شعراء

امرت سر ہمیشہ سے گوروؤں، صوفی، سنتوں، پیروں اور فقیروں کا گہوارہ رہا ہے نیز ساتھ ہی ساتھ علم وادب کا مرکز بھی، خواہ فارسی زبان ہو یا اردو، دونوں ہی کا اس سرزمین سے خصوصی تعلق ہے کیونکہ اس زمین نے فارسی اور اردو زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ جس کے ثبوت میں فارسی اور اردو ادباء کے ہاتھوں لکھی ہوئی کہانیاں، قصے، مضامین، کتابیں اور کلام کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت واقعہ تو یہ ہے کہ امرت سر کے فارسی شعراء کے ذکر کے بغیر پنجاب میں فارسی شاعری کی تاریخ رقم نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کے شعراء نے فارسی زبان کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر کے فارسی زبان وادب کی تاریخ کو اس قدر گراں بہا بنایا ہے کہ جس احسان سے فارسی زبان عہدہ برآنہیں ہوسکتی۔ اس لئے امرت سر کے فارسی شعراء کا ذکر ناگزیر ہے۔ انھیں شعراء میں ایک اہم نام عبدالرحمن شمس مینائی کا بھی ہے۔

عبدالرحمن شمسؔ مینائی

شمس الشعراء شمس مینائی اردو اور فارسی کے کہنہ مشق شاعر اور ادیب تھے۔ وہ 1876ء میں امرتسر میں متولد ہوئے اور 1896ء میں بیس سال کی عمر میں بمبئی چلے گئے۔ ان کی پہلی نظم میں 1900ء میں شہر امرت سے شائع ہوئی۔ اردو وفارسی کا مجموعۂ کلام 1946ء میں ''جام مینائی'' کے نام سے طبع ہوا جس میں بیان کی شگفتگی اور زبان کی شیرینی دیکھنے کو ملتی ہے۔ صداقت تو یہ ہے کہ ان کے کلام میں عصری تقاضے کے مسائل بھی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی جس کی بدولت اردو دنیا میں ایسی شہرت ملی جو امرتسر کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی۔ وہ اپنے تجربات ومشاہدات کو شعری جامہ کی شکل میں اس خوبی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری وسامع کے دل میں اترتے چلے جاتے ہیں:۔

طمع مدار ز امید و آرزو ای دل — خوش است آنکہ ز امید آرزو پاک است
مرا مپرس زداغی کہ در جگر دارم — بہ بین بہ چہرہ من زرد و چشم تر دارم
گدای گوشہ نشینم شہا کرم فرما — ز فرط لطف تو امید یک نظر دارم
من بہ حیرانم از فلسفہ زاہد خشک — می کہ در خلد حلال است حرام است اینجا
من گنہگارم وھم منفعلم مینائی — آن کہ بہ جرم خطا است کدام است اینجا 1

ظاہر ہے کہ شمسؔ مینائی کی شعریات میں جو زبان وبیان ہے وہ کسی بھی بڑے شاعر سے کم نہیں۔ ان کے یہاں عشقیہ بیان میں بھی شاعری کی قدیم روایتوں اور اساتذہ کا رنگ سخن نظر آتا ہے۔ انھوں نے شاعری کے وسیلے سے اصلاح اور فلاح انسانیت کا بھی کام لیا ہے۔

ان کے کلام میں جو لفظیات ہیں ان میں شگفتگی اور تازگی ہے۔ انھوں نے لفظیات کو چننے میں جس ہنرمندی کا تصرف کیا ہے یقیناً وہ قابل داد ہے۔ شمس مینائی کی بے شمار نظمیں علم اور تعلیم کے حوالے سے ملتی ہیں ان میں ایک نظم ''تنویر علم'' کے عنوان سے غیر معمولی نظم ہے۔ دراصل یہ بصیرت افروز نظم انھوں نے مدرسہ محمدیہ امرتسر کے سالانہ جلسہ منعقدہ 12/ اپریل 1929ء میں پڑھی تھی جس میں لطافت پائی جاتی ہے۔ شاعری کے فن پر ان کو جو دسترس تھی اسی کے پیش نظر انھیں ''شمس الشعراء'' کے لقب سے ملقب کیا گیا۔ انہوں نے غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ معرکۃ الآراء شہر آشوب بھی کہیں۔ چنانچہ امرتسر میں بارش اور موسمی بخار کی وباء سے عوام کو جن حالات سے گزرنا پڑا ان حالات کو نہایت موثر اور دردناک پیرائے میں عبدالرحمن شمس مینائی نے شہر آشوب کی شکل میں نظم کیا جسے ماہنامہ منرواکے مدیر نے 1908ء کے نومبر کے شمارہ میں صفحہ 39 سے صفحہ 40 تک اہتمام سے شائع کیا۔ یہ شہر آشوب امرتسر عوام کے حالات کی جس خوبصورتی سے ترجمانی کرتا ہے وہ لائق تحسین ہے۔

''حکیم الامت ڈاکٹر علامہ اقبال نے 1916-17ء میں ''اسرارِ خودی'' لکھی جس میں انہوں نے حافظ شیرازی پر کچھ نکتہ چینی کی تھی جس کا جواب انہوں نے ''لسان الغیب'' کے عنوان سے دیا۔ جس میں علامہ اقبال کی نکتہ چینی کا مدلل اور مسکت جواب ہے اس جواب کو پورے ملک میں سراہا گیا۔ حکیم فیروز الدین احمد فیروز نامور صحافی بھی تھے۔ انہوں نے متعدد اخباروں میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں انہوں نے ''مسیحا'' کی ادارتی ذمہ داری بھی سنبھالیں اور اسی کو انہوں نے ''ایشیاء'' کے نام سے شائع کیا۔ مولانا منہاس کے اخبار وکیل ہونے کے بعد وکیل کی ادارت بھی کی۔ انہوں نے ''وکیل'' اخبار کی کتابت بھی کی۔ یہاں انہیں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبداللہ العمادی کی ہم نشینی میسر ہوئی جس کی بدولت ملکۂ شاعری میں نکھار پیدا ہوا۔''

شمس الشعراء ابوالمعانی شیخ عبدالرحمٰن شمسؔ امرتسری اردو اور فارسی زبان کے بھی کہنہ مشق شاعر تھے۔افسوس کہ ایسا باکمال شاعر یکم ستمبر 1954ء کو لاہور میں چل بسا۔

عبیداللہ امرتسری:

خواجہ عباداللہ اختر کا تعلق کشمیر سے تھا۔شہر امرت سر میں 1880ء میں ولادت ہوئی ان کے والد محترم غلام رسول منٹو اور دادا خواجہ جمال الدین خانوادہ منٹو کے معزز افراد میں سے تھے۔ اختر کے بیٹے خواجہ کرامت اللہ قمر بہت ہی ذہین اور زیرک تھے۔ادب میں ماسٹر ڈگری اور قانون میں بیچلر ڈگری حاصل کرنے کے بعد جہلم شہر میں وکالت کی،خواجہ عبیداللہ اختر کا خاندان کا شمار علمی وادبی گھرانوں میں ہوتا تھا۔اختر نے اپنے دادا خواجہ جمال الدین کے زیر سایہ تحصیل علم کیا۔انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں بیدل، تذکرہ میرزا عبدالقادر بیدل، شرح دیوان حافظ،خلافت اسلامیہ،مشاہیر اسلام اور مذہب اسلام اہمیت کی حامل ہے۔

عبیداللہ اختر کا دیوان ہنوز شائع نہیں ہوا ہے البتہ ان کی صاجزادی محمودہ اختر کے حوالے سے خواجہ عبدالرشید نے اپنی کتاب ''تذکرہ شعرائے پنجاب'' میں چند اشعار نقل کئے ہیں ملاحظہ ہو:

خفتگان خواب غفلت را آگاہی چہ کار	در شب تیرہ چو اختر ہیچ کس بیدار نیست
نوای ساز درد دل نمی آید بگوش من	چو شمع مردہ رنگ انجمن خاموش می بینم
سرا پا سوختم بہر فروغ محفل امکان	چو شمع انجمن روشن کنم بزم حریفان را
بر سرمن آسمان بیستون خواہد شکست	نالہ من ہمچو تیشہ کار فرہاد من است
راز می نوشی مگو با صوفی پشمینہ پوش	پیر من پنہان بگوشم گفت ارشاد من است 2

مندرجہ بالا اشعار میں ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں کہ جو دوسروں کی شناخت میں مددگار ہوسکتی ہیں۔ان کا یہ کہنا ہے کہ جو لوگ غفلت کی نیند میں ہیں انھیں آگہی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا،اور تیرہ وتارراتوں میں کوئی انسان نہیں جاگتا۔انھوں نے یہ یقین دلانے کی سعی کی ہے کہ جب شمع بجھ جاتی ہے تو انجمن خود بخود خاموش ہو جاتی ہے۔ان کا یہ ماننا تھا کہ محفلا مکان کو فروغ دینے میں میں پورے طریقے سے جل گیا ہوں،اب دشمنوں کی بزم میں اس انجمن کو کیسے روشن کروں۔انھوں نے راز کو کسی سے بھی کہنے کی ممانعت کی اور صوفیوں کو پشمینہ پہننے کی ترغیب دی کیونکہ جو بزرگ ہے وہ پوشیدہ ہے۔ظاہر ہے کہ اختر کے یہ اشعار ان کے علو فکر اور زبان و بیان پر قدرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔لیکن افسوس کہ ایسا قادر الکلام شاعر 1909 میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگیا۔

فیروزالدین طغرائی:

حکیم فیروز الدین احمد فیروز طغرائی 1882ء میں کوچہ وکیلاں امرتسر میں متولد ہوئے۔ابھی دو سال ہی کے تھے آپ کے والد میاں شمس الدین کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔اس لئے خاطر خواہ تعلیم حاصل نہ کرسکے۔آپ نے شمس الدین داروغہ سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور شیخ عبدالرزاق خاکی سے بھی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔منشی شرف الدین سے کتابت کا فن حاصل کیا اور فن خطاطی میں یکتائے دہر بنے۔طغرائی نے کوتوال شہر امیر خاں کی لڑکی سے نکاح کیا۔کسب معاش کے لئے کیٹی کے محکمہ چونگی (ٹرمینل ٹیکس) میں نوکری کی۔وہاں کچھ ایسے افراد سے ملاقات ہوئی کہ شعر گوئی کا ذوق بیدار ہوا۔آپ نے نہ صرف اردو، فارسی اور عربی زبان میں شاعری کی بلکہ پنجابی زبان میں بھی اشعار لکھے۔کہا جاتا ہے کہ آپ بعض پنجابی شاعروں کو شعر بھی لکھ کر دیتے تھے۔صداقت تو یہ ہے کہ طغرائی نے پہلی نظم پنجابی زبان میں ہی لکھی۔مصحفی تو بہت کم اجرت میں لوگوں کو شعر لکھ کر دیتے،لیکن علامہ طغرائی بلا معاوضہ نہ جانے کتنے لوگوں کو شعر لکھ کر دیا کرتے تھے۔چنانچہ غلام مصطفٰے تبسم کا یہ کہنا تھا:

''اس معاملہ میں آپ کا مرتبہ مصحفی سے بلند تر ہے وہ صرف غزلیں بیچتے تھے آپ نے اپنی بلند پایہ نظموں،غزلوں،ادبی،عروضی،طبی،سیاسی اور تعلیمی مضامین وتصانیف سے جدائی گوارا کی،اس پر طرہ یہ کہ 1913ء میں آپ کی ایک بیاض جس میں تین سو سے زائد اُردُو وفارسی غزلیں تھیں کسی دزد سخن کے ہتھے چڑھ گئی اور اُس کا آج تک کوئی پتہ نہ چل سکا،شرح قصاید قاآنی مطبوعہ،لسان الغیب مطبوعہ،شرح دیوان غالب اُردُو (نامکمل) خاکسار نے اُن سے غالب کی فارسی غزلیات کی شرح بھی لکھوانی شروع کی تھی لیکن افسوس یہ کام بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

صداقت تو یہ ہے کہ آپ نے نہ جانے کتنے شعراء کے کلام پر اصلاح دی۔آپ کے سامنے جیسے ہی اشعار آتے تھے خفیف سے خفیف سقم کو بھانپ لیا کرتے تھے۔وہ ادنی سے تغیر سے مصرعوں کو بلند کردیتے چنانچہ حفیظ جالندھری کا آپ کے متعلق یہ کہنا تھا:

''میں نے ہندوستان بھر میں حکیم صاحب ایسا مصلح سخن نہیں دیکھا۔''3

حکیم الامت ڈاکٹر علامہ اقبال نے 17-1916ء میں ''اسرار خودی'' لکھی جس میں انہوں نے حافظ شیرازی پر کچھ نکتہ چینی کی تھی جس کا جواب انہوں نے ''لسان الغیب'' کے عنوان سے دیا۔ جس میں علامہ اقبال کی نکتہ چینی کا مدلل اور مسکت جواب ہے اس جواب کو پورے ملک میں سراہا گیا۔حکیم فیروز الدین احمد فیروز نامور صحافی بھی تھے۔انہوں نے متعدد اخباروں میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں انہوں نے ''مسیحا'' کی ادارتی ذمہ داری بھی سنبھالیں اور اسی کو انہوں نے ''ایشیاء'' کے نام سے شائع کیا۔مولانا منہاس کے اخبار وکیل ہونے کے بعد وکیل کی ادارت بھی کی۔انہوں نے ''وکیل'' اخبار کی کتابت بھی کی۔یہاں انہیں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبداللہ العمادی کی ہم نشینی میسر ہوئی جس کی بدولت ملکۂ شاعری میں نکھار پیدا ہوا۔عمادی صاحب کی ہی تحریک کے نتیجے میں فارسی شاعری کی طرف رغبت میں اضافہ ہوا۔اسی عہد میں فارسی زبان میں متعدد غزلیں بھی کہیں۔یہاں پر ایک بلیغ فارسی غزل کا مطلع درج کیا جارہا ہے:

دل سوزاں زمن و دیدۂ گریاں از من
اندریں بزم چہ شمعیست فروزاں از من

انہوں نے رسالہ میں ''طبی رباعیات'' کے عنوان سے رباعیات بھی شائع کیں۔فارسی میں طغرائی اور اردو نظموں میں فیروز کے تخلص سے شاعری کی،علامہ طغرائی کا 1908ء میں ''کلام فیروز'' کے نام سے مجموعہ کلام شائع ہوا جس کی خوب پذیرائی ہوئی مولانا حسرت موہانی کا یہ کہنا تھا:۔

''پنجاب میں مسٹر سر اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ پنجاب کے شاعروں میں طغرائی کا نام لیا جاسکتا ہے۔''4

صداقت تو یہ ہے کہ ان کا کلام متانت وجزالت سے لبریز ہوتا تھا۔ان کے یہاں جو خیالات کی ندرت اور طرز بیان میں جدت تھی وہ ارباب نظر کو متوجہ کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔علامہ طغرائی نے ان اشعار میں زمانے کی نیرنگیوں کو دکھاتے ہوئے احتساب کی دعوت بھی دی ہے۔ان کے کلام میں جو پختگی اور متانت ملتی ہے وہ بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی۔بطور ثبوت یہ اشعار دیکھئے:

چہ در گہبیست فلک با شعاع مہر ازان	غبار و گرد بروید دم طلوع سحر
چہ روضہ ایست کہ آنجا ز بارش انوار	نہ ممکن است شدن امتیاز شام و سحر
ای چشم اگر تو ابر نہ ای جوش اشک چہ ای؟	ای دل اگر تو برق نہ ای اضطراب چیست!
آمد پس فنا زلب گورم این صدا	اینت مآل زندگی مستعار
اقرب از جبل ورید است وزمن دور تراست	حیرتم باد کہ شد دور رگ جان از من 5

حکیم فیروز الدین احمد فیروز امرتسری کو اردو زبان کی بیشتر نظمیہ اصناف پر یکساں قدرت حاصل تھی خصوصاً غزل،مرثیہ،قصیدہ،مثنوی،خمسہ،مسدس،ترجیع و ترکیب بند پر جو دسترس حاصل تھی وہ صاحبانِ فن کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ان کا طرز بیان شعر کے حسن کو دوبالا کردیتا ہے۔

ان کے یہاں عاشقانہ رنگ کے اشعار بھی ملتے ہیں۔انہوں نے قومی اور نیچرل نظمیں جو کہی ہیں وہ بھی خاصہ کی چیز ہیں۔ بلا شبہ اصناف سخن میں قصیدہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔علامہ نے فارسی و اردو میں مدحیہ ونعتیہ اور قومی قصائد لکھے۔ان کے قصائد میں جارج پنجم کے جشن تاج پوشی کے موقع پر کہا گیا قصیدہ اور نواب رام پور کی شان میں کہے گئے قصیدے تاریخ قصائد میں اہمیت کے حامل ہیں۔

ظاہر ہے کہ قصیدہ میں جو فصاحت و ندرت اور عقیدت ہے وہ ہر صاحب علم کو اپنی جانب کھینچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔قافیہ و ردیف اس قدر رواں اور آسان ہیں کہ انسان کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔فیروز الدین احمد طغرائی کی زبان صاف وشفاف ہے اور ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر شعر پختگی ومتانت کا نمونہ ہے۔اس عہد میں فارسی زبان میں ایک آدھ شاعر ہوگا کہ جو ان کے پایہ کا ہو۔جس کی دلیل کے لئے ان کے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

دلِ سوزاں زمن و دیدۂ گریاں از من　　اندریں بزم چہ شمعیست فروزاں از من
واعظا خیز کہ اندازِ تقابل ورزیم　　باغ فردوس زتو کوچۂ جاناں از من
اے جنوں گر بتو خود را نسپرم چہ کنم　　اندریں حال کہ دست از تو گریباں از من
وائے بر من کہ بختیں نگہی صیدم کرد　　چشمہا داشتہ آں نرگس افشاں از من
تیرہ بختی ہم از اقبال سکندر کم نیست　　چشم را بست فرو چشمۂ حیواں از من [6]

ان اشعار میں ان کے طرز بیان نے جان ڈال دی ہے۔ان کا فارسی کلام مضامین اور زبان کے اعتبار سے اپنی آپ بے نظیر ہے۔حقیقت واقعہ تو یہ ہے کہ آپ نے سب سے زیادہ اردو زبان میں اشعار کہے، بعدہ فارسی زبان میں شاعری کی اس کے علاوہ پنجابی زبان میں آپ نے صرف اشعار ہی نہ کہے بلکہ پنجابی زبان کے بڑے بڑے شعراء نے آپ سے استفادہ بھی کیا۔اس کے علاوہ آپ نے عربی زبان میں بھی اشعار کہے۔عربی شاعری کا سرمایہ کم ضرور ہے لیکن جتنا بھی ہے وہ قابل قدر ہے۔

آپ نے ''نکاتِ غالب'' کے عنوان سے دیوان غالب کی جامع و مانع شرح لکھنا شروع کیا تھا لیکن افسوس کہ آپ کی عمر نے وفا نہ کی اور اسے تکمیل تک نہ پہنچا سکے اور 8/فروری 1931ء میں نصف صدی کی عمر میں دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

صوفی تبسم بیک وقت بہترین مترجم، بے مثل صحافی اور بہترین شاعر تھے۔آپ نے تینوں زبانوں میں شاعری بھی کی، وہ فارسی زبان و ادب کے حقیقی پرستار تھے کیونکہ انھوں نے پوری زندگی فارسی زبان کی تعلیم و ترویج کے لئے وقف کر دی۔بچوں کے لئے آپ نے نظمیں بھی لکھیں ان کا فارسی کلام 1961ء میں ''انجمن'' کے نام سے شائع ہوا، جس کی ادبی دنیا میں خوب پذیرائی ہوئی۔بچوں کے لئے لکھی گئی کتابیں ٹوٹ بٹوٹ، ٹول مٹول اور جھومنے بھی بیحد مقبول ہوئیں اور اردو کلام 1986ء میں ''دامن دل'' کے نام سے شائع ہوا۔اس کے علاوہ 1986ء میں نظم، گیت اور ترانوں کا مجموعہ ''سر مشک تبسم'' کے نام سے چھپا اور پنجابی کلام کا مجموعہ ''نظر کر دیا گلاں'' کے نام سے منصۂ شہود پر آیا۔1990ء میں فارسی، اردو اور پنجابی کلام کا مجموعہ ''کلیات صوفی تبسم'' کے نام سے ظہور پذیر ہوا۔آپ شاعر ہی نہیں بہترین نثر نگار بھی تھے۔آپ کی نثری کتب میں پنجاب کی فارسی شاعری پر فارسی روایات کا اثر، مسلمانوں کا علم جغرافیہ اور شوقِ سیاحت اور حکمت قرآن اہمیت کی حامل ہیں اور تراجم میں نقش اقبال فارسی سے منظوم پنجابی ترجمہ، سرا پردۂ افلاک (اردو جاوید نامہ 1977ء) شرح غزلیات، غالب فارسی (دو جلدیں) دو گونہ (منظوم اردو ترجمہ غزلیات امیر خسرو) جاہ و جلال (اردو POWER & GLORY) اور 1977ء میں شرح صد شعر اقبال کو علمی و ادبی دنیا میں وقعت کی نظروں سے دیکھا گیا۔چنانچہ ان کے علمی خدمات کا اعتراف بھی کھلے دل سے کیا گیا 1959ء میں نشانِ سپاس حکومت ایران، 1962ء میں ''ستارۂ خدمت'' نیز 1976ء میں ''ستارۂ امتیاز'' کے اعزازات سے نوازا گیا۔

صوفی غلام مصطفی تبسم کے کلام میں عشقیہ مضامین اور حکایت دل کا بیان بڑے ہی خوبصورت پیرائے میں ملتا ہے۔انہوں نے زندگی کے حقائق کو جس پیرائے میں بیان کیا ہے وہ اردو شاعری میں خاصہ کی چیز ہے۔ان کا پسندیدہ موضوع شراب اور شاہد ہے۔صوفی کے کلام میں پامال مضامین نظر نہیں آتے بلکہ وہ نئے نئے انداز سے اپنے مافی الضمیر کو شاعری میں نظم کرتے ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ:

خوشا نصیب کہ زیب کنار من باشی　　قرار جان و دل بیقرار من باشی
حدیث درد و الم بشنوی از راہ کرم　　بہ چارہ سازی جان فگار من باشی
جہان زحسن تو ہموارہ گلشن آباد است　　چہ خوش بود کہ یکی نوبہار من باشی
بر روی صنم باید بیباک نظر کردن　　دزدیدہ نگاہی نیست آئین تماشائی
در کوی تو امروز زماختہ تری نیست　　افتادہ براہیم وکسی را خبری نیست [7]

صوفی نے ان اشعار میں وجہ سکون کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ آپ کی ذات ایسی ہے کہ جس سے میرے بے قرار دل کو قرار اور سکون ملتا ہے۔اس لئے مجھ پر کرم ہوگا کہ اگر آپ میرے درد والم کی باتوں کو سنئے گا کیونکہ یہ بات میرے دل کے بہلانے کا ذریعہ ہے۔انھوں نے محبوب کی محبت کے فیضان کا گن گان کرتے ہوئے یہ یقین دلایا ہے کہ محبوب کے حسن کی بدولت یہ دنیا آباد ہے۔لہذا کتنا اچھا ہوتا کہ محبوب زندگی میں آ کر زندگی کو پر بہار بنانے کا ذریعہ بن جاتا۔انھوں نے ان اشعار کے حوالے سے یہ باور کرایا ہے کہ محبوب پر بے خوف و خطر نظر ڈالنی چاہئے۔چوری کی نگاہ نہیں ڈالنی چاہئے کیونکہ وہ تماشائی کی نگاہ ہوتی ہے۔اس طرح صوفی نے ظاہر و باطن کو ایک جیسا رکھنے کی تلقین کی ہے۔صداقت تو یہ ہے کہ فارسی شاعری میں انھوں نے نو بہ نو مضامین نظم کئے ہیں بطور ثبوت ان کا یہ کلام بھی ملاحظہ ہو:

یارم اندر کنار می آید　　در چمن نو بہار می آید
برغم عشق می کنم نازی　　کہ مرا غمگسار می آید
برغم ما بسی تبسم کرد　　باری ہم اشکبار می آید
دست در زلف یار می باید　　سر بپای نگار می باید
شوق تیز است و خلوت کوتاہ　　شغل بوس و کنار می باید [8]

غلام مصطفے صوفی نے دوست کی اہمیت کو بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ دوست کی آمد کو زندگی میں وجہ سکون ہے۔انھوں نے یہ یقین دلایا ہے کہ دراصل دوست کی آمد کے سبب چمن میں ایک نئے طریقے کی بہار آجاتی ہے۔اس لئے اپنے غم پر ناز اور مسکرانا چاہئے کیونکہ ایک دوست ہی ہمارے غم پر آنسو بہاتا ہے اور حالت کو دیکھنے والا ہوتا ہے۔

صوفی غلام تبسم کا کلام بہت ہی پر اثر اور دلکش ہے۔ان کے بیشتر اشعار ایسے ہیں کہ جو زبان زد خاص و عام ہیں۔انہوں نے زندگی کی صداقتوں اور واردات قلب کو اشعار میں جس طرح ڈھالا ہے اس سے اردو شاعری کا سرمایہ گراں قدر ہوا ہے۔وہ 7/فروری 1978ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے لیکن وہ اپنے علمی اور ادبی کارناموں کے سبب ادبی دنیا میں بقائے دوام کے مالک ہیں کیونکہ ان کے نزدیک موت کی حقیقت یہ ہے:

موت کی دھمکیاں نہ دو ہم کو　　موت کیا زندگی نہیں ہوتی [9]

غلام قادر گرامی

ملک الشعراء غلام قادر گرامی 1856ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے لیکن قلیل عرصہ کے لئے انھوں نے امرتسر میں قیام کیا۔آپ کے والد کا نام شیخ سکندر بخش تھا۔گرامی نے ابتدائی تعلیم ایک مسجد میں حاصل کی بعد ازاں خلیفہ ابراہیم صاحب کے مکتب میں داخل ہوئے بالآخر اورینٹل

کالج لاہور سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔آپ نے مختلف ملازمتیں کیں ۔امرتسر کے ایک اسکول میں فارسی کے مدرس تھے کچھ مدت بعد وہ ملازمت ترک کر کے کپورتھلہ چلے گئے ۔امرت سر کے علاوہ پنجاب کے مختلف شہروں یعنی کپورتھلہ ،ملیر کوٹلہ اور لدھیانہ میں بھی ملازمت کی لیکن اپنے مزاج اور طبیعت کے باعث انھیں قرار نہ آیا یہ دیکھ کر وزیر اعظم پٹیالہ محمد حسین نے دکن جانے کا مشورہ دیا ۔چنانچہ گرامی حیدر آباد روانہ ہو گئے وہاں ان کی قسمت نے یاوری کی انھیں دکن میں مختلف مواقع پر گراں قدر انعامات ملے جس بنا پر ان کے لوگ حاسد بھی بن گئے ۔داغ دہلوی نے ایک مرتبہ ان کو لکھا'' تم تو اُدھر پنجاب کسی چھوٹے موٹے قصبے میں بیٹھے ہو ادھر ہمارے قدر و منزلت کا یہ حال ہے کہ نظام کے ہمراہ شکار پر جارہے ہیں سواری کے لئے ہاتھی اور کیا کچھ نہیں،'' گرامی نے داغ دہلوی کو جواب میں لکھا:

تو دانی گرامی کہ وقت شکار   نوازند شاہاں سگ داغدار

گرامی جالندھری کے اس جواب سے ان کی حاضر جوابی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔شاعری میں گرامی جالندھری کی بر جستہ گوئی کو دیکھ کر علامہ اقبال نے ان کی عظمت کا کچھ اس طرح اعتراف کیا تھا۔

''اگر عُرفی اور نظیری کے بعد فارسی زبان کا کوئی شاعر ہے تو گرامی ہے
آج گرامی کو سن لو کل تمہاری نسلیں فخر کریں گی کہ تم نے گرامی کو سنا اور دیکھا ہے''

علامہ اقبال کے اس اعتراف سے گرامی کی عظمت اور شاعری پر ان کی دسترس کا ہمیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔ دکن میں میر محبوب علی غفران پناہ کے دربار میں قدر بلگرامی کی جگہ شاعر خاص مقرر ہوئے اور وہیں یعنی دکن میں ملک الشعراء کے خطاب سے نوازے گئے ۔آپ نے دکن میں پینتیس سال قیام کیا۔گرامی ذیابطیس کی بیماری میں مبتلا ہو کر پنجاب آگئے اور ہوشیار پور میں مستقل قیام کیا۔آخر کار 26مئی 1927ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ہوشیار پور کے قبرستان کندن شاہ بخاری میں تدفین عمل میں آئی۔

غلام قادر گرامی نے اپنے کلام کی حفاظت سے بے پروا تھے ۔ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں اور اعزہ نے ان کے کلام جمع کئے اور اس طرح گرامی کی تصنیفات میں دیوان گرامی اور رباعیات گرامی کا پتہ چلتا ہے جو ادبی دنیا کے لئے بیش قیمت سرمایہ ہیں ۔گرامی کے کلام میں علمیت کا اظہار،فلسفیانہ فکری عمق ، انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی اور مطالعے و مشاہدے کی فراوانی بدرجۂ اتم نظر آتی ہے ۔علامہ اقبال کا ان کی شاعری کے متعلق یہ کہنا تھا'' گرامی شاعری میں تلمیذ روح الامین ہے'' اور حفیظ جالندھری کا یہ فرمان تھا:

''فنافی اللہ لوگ شاید بہت ہوں گے لیکن فنافی الشعر جسے کہنا چاہے وہ
میری دانست میں گرامی تھے''

گرامی کی شاعری کا بیشتر سرمایہ فارسی زبان میں ہے ان کا کہنا تھا کہ:

''غالبؔ، میر انیسؔ، آتشؔ اور مومنؔ کے ہوتے ہوئے اردو میں لکھنا
جھک مارنا ہے۔''10

گرامی نے اسی لئے فارسی زبان میں شاعری کی جانب توجہ زیادہ مبذول کی اور انوری ، ابیوردی ،شیرازی عرفی وغیرہ کے طرز کا اتباع کیا جیسا کہ ڈاکٹر ظہور الدین رقمطراز ہیں :

''گرامی جالندھری کو حافظ شیرازی، جامی، عرفی شیرازی اور نظیری نیشاپوری بہت مرغوب تھے وہ اُن کے تتبع میں کلام لکھتے تھے اور فارسی زبان ومحاورہ پر تسلط کی بدولت اور ذہنی قابلیت کی بنا پر نئے سے نیا مضمون نکالنے کی کوشش کرتے تھے،نئی سے نئی تشبیہ لاتے اور فن شاعری کو نمایاں کرتے تھے،سبک ہندی کے شعراء کی طرح تشبیہ تمثیلی کو بھی عام استعمال کرتے تھے''.

ڈاکٹر ظہور الدین کا یہ کہنا صداقت پر مبنی ہے جس کے ثبوت میں حضور نظام کی تہنیت سالگرہ کے موقع پر کہے گئے قصیدہ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

سرکنم حرف مدیح مالک خسرو رکاب   حلقہ بر درآسمانش حلقہ در گوش آفتاب
حضرت عثماں کہ آمد بر درش ہر بندہ   کام جو و کام بخش و کامگار روکامیاب
محترم از طبع او ہمت چوگل از رنگ و بو   مستفیض از گوہرش ہستی چو ماہ از آفتاب
جلوہ گردر رائے او پرتو چو در خورشید نور   معتبر از خلق او نگہت چو از بو مشکناب
فلسفی گوید کہ چوں شد چرخ فلک   می دہم من از رہ دانش سوالش را جواب 11

گرامی جالندھری نے اس قبیل کے متعدد قصائد نوابوں ،امراء اور مشائخ کی شان میں کہے ہیں جس سے ان کی زبان پر قدرت ،بلند خیالی اور علمی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے ۔بطور ثبوت خواجہ غریب نواز کی شان میں کہی گئی منقبت بھی ملاحظہ ہو:

راہ فردا می زند امروز من اے وائے من   غوطہ در گرداب امروزم خورو فردائے من
کلبۂ تاریک من منت کش خورشید نیست   صبح محشر سایہ پرور دشب یلدائے من
بر در حرف آشنایاں سر نمی آرم فرود   کوس معنی زد ادب بر بام استغنائے من
ہستیٔ من مستیٔ منصور دارد در دماغ   می چکد خون انا الحق از لب گویائے من 12

غلام قادر گرامی کے یہاں الفاظ کی بندش و چستی اور ندرت بیان جو نظر آتا ہے وہ انھیں شعرا کے اژدہام میں انفراد عطا کرتا ہے ۔اگر وہ اردو شاعری کی طرف فارسی شاعری کی طرح توجہ دیتے تو وہ اردو میں بھی اپنی خداداد صلاحیتوں کا اظہار کر کے شہرت اور قبولیت کے اس مرتبے پر فائز ہوتے جو بہت کم لوگوں کو اردو میں نصیب ہوئی ۔

مندرجہ بالا شعراء کے علاوہ آغا خلش امرت سری ،انوری امرت سری ،برہم ناتھ دت قاصر، شجاع خاں شیون، کرامت اللہ، فیروز الدین رازی ،محمد حسین عرشی ،محمد الدین غریب، منشی عطا محمد اور پنڈت نرنجن ناتھ تکو وغیرہ امرت سر میں فارسی کے ان شعراء میں ہیں جنھوں نے اپنی فکری بصیرت اور ذہنی جودت کو بروئے کار لا کر فارسی زبان وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

حواشی

1 تذکرہ شعرائی پنجاب،خواجہ عبد الرشید، مطبع انڈسٹریز پرنٹرز کراچی، اکتوبر 1967، صفحہ 357
2 ایضا، صفحہ 30
3۔ماہنامہ چمنستان، طغرائی نمبر ص:20
4۔چمنستان امرتسر، طغرائی نمبر ص:15
5 تذکرہ شعرائی پنجاب، خواجہ عبد الرشید، صفحہ 225
6۔غالب، امرتسر مارچ 1927ء
7 تذکرہ شعرائی پنجاب، خواجہ عبد الرشید، صفحہ 97
8 ایضا، صفحہ 98-97
9۔پیمانہ غزل ،ج:اول محمد شمس الحق طبع مارشل پرنٹنگ پریس راولپنڈی طبع اول ،2008ء ،ص:354
10۔شعرائے پنجاب (عصر حاضر) مرتبہ ملک محمد باقر نسیمؔ رضوانی، مطبوعہ، 1937ء گجرات پرنٹنگ پریس گجرات پنجاب، ص:31۔
11۔دیوان گرامی جالندھری، عبد القادر گرامی، صفحہ 186
12۔ایضا، صفحہ 170

❑❑❑

ڈاکٹر عمیر منظر

مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی لکھنؤ کیمپس۔لکھنؤ

8004050865

اردو غزل میں گھر کی صورت اور صورت حال

گھر ایک وسیع الذیل لفظ ہے ۔اسے سماجی علوم کے ایک مہذب لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں کیونکہ اس اعتبار سے یہ ایک شناخت کا اشاریہ بن جاتا ہے ۔مہذب انسانی سماج کی ایک پہچان گھر ہے ۔اسی سے کسی فرد کی شناخت ہوتی ہے ۔انسانی معاشرہ میں بہت سے حقوق اسی سبب سے کسی کو حاصل ہوتے ہیں اور گھر کے نہ ہونے سے وہ بے شمار حقوق سے محروم ہو جاتا ہے ۔دربدری اور بے گھری لفظ اس کے برخلاف استعمال ہوتا ہے یعنی شناخت کا نہ ہونا ہے ۔پہچان کا گم ہو جانا۔گھر انسانی سماج کا بہت بڑا مسئلہ رہا ہے اور اسی لیے گھر کی تعمیر انسانی معاشرہ کا ایک مشکل اور خوب صورت ہدف رہا ہے ۔اس کے لیے کیا کیا جتن کیے جاتے رہے ہیں ۔اور گھر کی تعمیر کے لیے انسانی کوششوں کے کیسے کیسے واقعات ہیں ۔انسانی تاریخ ان واقعات سے بھری پڑی ہے ۔

ادبی اعتبار سے بھی اس لفظ میں بے پناہ تخلیقی زرخیزی موجود ہے ۔اسی تناظر میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ بعض الفاظ اپنی متعدد پہچان رکھتے ہیں ۔ان مختلف اور متعدد پہچان میں اس کے حوالے مختلف ہیں ۔باوجودیکہ اس کے مختلف حوالے ہیں مگر ان کا الگ الگ انداز ایک اکائی بننے کی طاقت رکھتا ہے اور ہر اکائی جامعیت کی ایک روشن مثال کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے ۔لفظ گھر کا تنوع خاصا دلچسپ اور قابل رشک ہے ۔دیگر علوم کے ساتھ ساتھ اس کا ایک ادبی اظہار بھی بہت پرکشش ہے ۔اردو شاعری خصوصاً غزل میں اس لفظ کا تنوع اور اس کی ہمہ جہت تخلیقی سرگرمی ایک نئی کائنات سے روشناس کراتا ہے ۔

اردو شاعری میں شعرا نے لفظ 'گھر' اور اس کے تصور کو سامنے رکھ کر جو شاعری کی ہے اور اس لفظ کے جو نئے نئے معنی پہنائے ہیں وہ دیکھنے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔اس کی تعبیر و تفہیم بھی خاصی دلچسپ اور پرلطف ہے اور اس کی تعبیر و تفہیم کا فریضہ انجام دینے کی کوشش کی ہے ۔گھر کہیں لفظی معنی میں تو کہیں کسی کے دل میں گھر کرنے اور کہیں اس کے وسیع تصور کے ساتھ باندھا ہے ۔یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی جس طرح اردو شاعری میں کی جاتی ہے اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی ۔اردو شاعری کے نگارخانے میں لفظ گھر پر مبنی طرح طرح کے اشعار موجود ہیں ۔گھر اور اس کے متعلقات میں بہت سے الفاظ ہیں جن سے شعرا نے فائدہ اٹھایا ہے ۔بے گھری اور دربدری جیسے الفاظ کا استعمال بھی اسی ذیل میں کیا جاتا ہے ۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

میر اب بہار آئی صحرا میں چل جنوں کر
کوئی بھی فصل گل میں نادان گھر رہے ہے
میر تقی میر

بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کیوں نہ ہو
مرزا غالب

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا اپنا پرایا بھول گیا
میرا جی

> ”گھر اور بے گھری کا ایک عام استعمال کیا ہے مگر ان شعرا کی تخلیقی ہنر مندی نے ایک عام سے لفظ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے ۔اور تخلیقی قوت کی شان ان میں پیدا کر دی ہے ۔
> غزل کے روایتی مضامین میں محبوب کے دل میں جگہ بنانا عاشق کی سب سے بڑی کامیابی ہے ۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری خصوصاً غزل میں محبت کا گھر بنانا بھی ایک اہم ادبی معرکہ ہے ۔
> اسی لیے بہت سے شعرا نے کہا ہے کہ اگر محبت کا کوئی گھر بنانا ہے تو لوگوں کے دلوں پر دستک دیجیے ۔شاعری میں یہ دستکیں دی جاتی رہی ہیں اور محبت کی دنیا آباد کی جاتی رہی ہے ۔ولی کا ایک شعر ہے ۔
> ادا و ناز سوں آتا ہے وو روشن جبیں گھر سوں
> کہ جیوں مشرق سے نکلے آفتاب آہستہ آہستہ
> مشرق سے آفتاب کے آہستہ آہستہ نکلنے کا نظارہ ہم اکثر کرتے ہیں ۔کچھ یہی انداز ادا و ناز کے ساتھ اس روشن جبیں محبوب کے گھر سے نکلنے کا بھی ہے ۔گھر دل کی طرح ہے جس میں نہ جانے کیا کیا کچھ ہوتا ہے ۔اس سے بہت نشانیاں اور یادیں وابستہ ہوتی ہیں ۔“

بے وقت اگر جاؤں تو سب چونک پڑیں گے
اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

بشیر بدر

سفر ہے ختم مگر بے گھری نہ جائے گی
ہمارے گھر سے یہ پیغمبری نہ جائے گی

ولی عالم شاہین

گھر اور بے گھری کا ایک عام استعمال کیا ہے مگر ان شعرا کی تخلیقی ہنر مندی نے ایک عام سے لفظ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔اور تخلیقی قوت کی شان ان میں پیدا کر دی ہے۔

غزل کے روایتی مضامین میں محبوب کے دل میں جگہ بنانا عاشق کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری خصوصاً غزل میں محبت کا گھر بنانا بھی ایک اہم ادبی معرکہ ہے۔اسی لیے بہت سے شعرا نے کہا ہے کہ اگر محبت کا کوئی گھر بنانا ہے تو لوگوں کے دلوں پر دستک دیجیے۔شاعری میں یہ دستکیں دی جاتی رہی ہیں اور محبت کی دنیا آباد کی جاتی رہی ہے۔ولی کا ایک شعر ہے۔

ادا و ناز سوں آتا ہے وو روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سے نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

مشرق سے آفتاب کے آہستہ آہستہ نکلنے کا نظارہ ہم اکثر کرتے ہیں۔کچھ یہی انداز ادا و ناز کے ساتھ اس روشن جبیں محبوب کے گھر سے نکلنے کا بھی ہے۔گھر دل کی طرح ہے جس میں نہ جانے کیا کیا کچھ ہوتا ہے۔اس سے بہت نشانیاں اور یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔سب سے قیمتی شے محبوب کی یاد ہوتی ہے۔جگر کے بقول۔

خیال یار سلامت تجھے خدا رکھے
ترے بغیر کبھی گھر میں روشنی نہ ہوئی

احمد مشتاق کہتے ہیں۔

پتا اب تک نہیں بدلا ہمارا
وہی گھر ہے وہی قصہ ہمارا

محبوب اور اس کی یادوں سے جہاں گھر آباد ہوتا ہے وہیں اس کے جانے کے بعد صورت بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔مولانا الطاف حسین حالی نے اس کا کیا خوب عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں

دل آباد کہاں رہ پائے اس کی یاد بھلا دینے سے
کمرہ ویراں ہو جاتا ہے اک تصویر ہمانے سے

جلیل عالی

دل کی ویرانی کی طرح ہی گھر کی ویرانی اور تنہائی بھی ہے۔تنہائی کی یہی صورت ایک بیابان اختیار کر لیتی ہے۔اور دیکھتے دیکھتے پھر دشت اور گھر ایک جیسے لگنے لگتے ہیں۔اس صورت حال کو مرزا غالب نے ایک شعر میں کس سلیقہ سے ادا کیا ہے۔ان کا یہ شعر بجا طور پر مشہور ہے۔حالی نے یادگار غالب میں اس کی تشریح کی ہے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دشت کی ویرانی کو دیکھ کر گھر کی ویرانی کو یاد کرنا واقعی مرزا غالب نے غضب کا مضمون نکالا ہے اور خوب ہے۔حالی نے یادگار غالب میں مرزا کے جن اشعار کی تشریح کی ہے یا جن کی داد دی ہے ان میں یہ شعر بھی شامل ہے۔خواجہ حالی نے اس کے دو معنی بیان کیے ہیں۔ویرانی پر ظفر اقبال نے بھی ایک خوب صورت شعر کہا ہے۔

نکل جائے گی آئینے سے صورت
ہمارے گھر میں ویرانی رہے گی

ناصر کاظمی جدید شاعروں کے پیش رو کے طور پر جانے جاتے ہیں۔انھوں نے گھر، دیوار، اداسی سے کیا خوب شعری پیکر خلق کیا ہے۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

ناصر کاظمی نے جس عہد کو دیکھا اور ویرانی و بربادی کا منظر نامہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے محض ایک شعر میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ان کی یادوں میں بہت سی باتیں ایسی ہیں۔ان کے یہاں یاد اور یاد نگر کا تصور ہے۔ماضی ان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ناصر کاظمی کی مشہور نظم 'نشاط خواب' جو کہ 'انبالہ' سے متعلق ان کی یادوں کا حسین گلدستہ ہے۔

مرغابیاں تلی ہوئی تیتر بھنے ہوئے
خستہ کباب سیخ کے اور نان روغنی
انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی

تنہائی اور اداسی اردو شاعری خصوصاً غزل کا ایک اہم مضمون ہے۔جدید شاعروں کے یہاں تنہائی کا مسئلہ بہت زیادہ۔بلکہ یہ ایک طرح سے بے گھری کا ہی حصہ یا اس کی توسیع سے عبارت ہے۔شہریار کا بہت مشہور شعر ہے۔

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو
تاحد نظر ایک بیابان سا کیوں ہے

جدید شاعروں میں ایک اہم نام شجاع خاور کا ہے۔نئے نئے مضامین انھوں نے خوب نکالے ہیں۔تنہائی کا مضمون بھی ان کے یہاں ہے۔بلکہ اس مضمون کا ایک شعر تو بہت مشہور ہے۔

تنہائی کا ایک اور مزہ لوٹ رہے ہیں
مہمان مرے گھر میں کئی آئے ہوئے ہیں

ایک دوسرا شعر ہے

اسی پر خوش ہیں کہ اک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں
ابھی تنہائی کا مطلب نہیں سمجھے ہیں گھر والے

جدید غزل کے ایک اور نہایت معتبر شاعر منچندہ بانی کا شعر ہے۔

کوئی بھی گھر میں سمجھتا تھا نہ تھا مرے دکھ کو
اک اجنبی کی طرح میں خود اپنے گھر میں تھا

آزادی کے بعد قتل و خوں اور تباہی و بربادی کی جو داستان رقم ہوئی اس نے گھر کو ایک نئی صورت عطا کی۔گھر ایک پناہ گاہ اور مسکن کے طور پر تو تھا ہی مگر شعرا نے اس کے دیگر پہلوؤں کو بھی شعری پیکر عطا کیا۔اس پورے المیے کو شہپر رسول نے جس طرح ایک شعر میں پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔تقسیم کا جو ظاہری کرب تھا وہ سب پر واضح تھا مگر فن کار نے اسے باطن سے بھی وابستہ کر کے ایک نئی صورت پیدا کر دی۔بے بسی و بے گھری کی نہ جانے کتنی داستانیں ان دو مصرعوں میں شامل کر دی گئیں۔

مجھے بھی لمحہ ہجرت نے کر دیا تقسیم
نگاہ گھر کی طرف ہے قدم سفر کی طرف

سیاسی اور معاشرتی حوالوں سے اور کسی قدر آزادی کے تناظر میں بہت کچھ کہا گیا۔نظمیں کہی گئیں مگر یہ شعر اپنی مثال آپ ہے۔اسے غزل کا جادو بھی کہا جاسکتا ہے۔سیاسی اور سماجی ہنگاموں میں گھر کا بیانیہ تبدیل بھی ہوتا ہے اور اس کے بعض دوسرے پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔دراصل اسے ہم تخلیقی قوت سے تعبیر کر سکتے ہیں کہ شعرا نے کس خوبی سے طرح طرح کے معنی اس لفظ سے خلق کیے اور شاعری کے تقاضوں کو بھی نبھایا۔بانی کا شعر ہے

تمام شہر کو مسمار کر رہی تھی ہوا
میں دیکھتا ہوں وہ محفوظ کس مکان میں ہے

جدیدیت کے بانی اور ممتاز ناقد جناب شمس الرحمن فاروقی جو کہ خود ایک نہایت باکمال شاعر ہیں ان کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

کردار قتل کرنے لگے لوگ یوں کہ ہم
اپنے ہی گھر میں بیٹھ کے آوارہ ہوگئے

شمس الرحمن فاروقی

آزادی کے بعد فسادات اور گھروں کی تباہی کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ کسی نہ کسی صورت میں اب تک جاری ہے۔ یہ مہذب دنیا کا ایک المیہ ہے کہ اس کے یہاں اب بھی انسانی بستیوں کو جلانے اور راکھ کرنے کی کوئی نہ کوئی صورت باقی ہے۔ یہ اس عہد کا بڑا المیہ ہے۔ ایک سماجی زندگی کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے۔ صورت کوئی بھی ہو مگر تعمیر میں خرابی کی صورت نمایاں ہے۔ فسادات کے زمانے میں بعض اشعار بہت مشہور ہوئے تھے۔ بشیر بدر کا شعر مشہور زمانہ ہوا

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

عرفان صدیقی نے اس صورت حال کو اپنی فنی چابک دستی کے ساتھ کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔ دکھ ان کا بھی وہی ہے مگر انھوں نے بستی کی متضاد صورت صحرا اور وحشت سے کیا خوب مضمون پیدا کیا ہے۔

وہ جو ایک شرط تھی وحشت کی اٹھا دی گئی کیا
میری بستی کسی صحرا میں بسا دی گئی کیا

گھر دراصل انسان کے خوابوں کا آئینہ ہوتا ہے۔ وہ بہت محنت، توجہ اور بے شمار ارمانوں اور آرزوؤں سے اسے تعمیر کرتا ہے۔ اور اسے اپنے لیے وجہ امتیاز تصور کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر کچھ اس کے خلاف ہوجائے تو اسے اپنی زندگی بھر کی بے بسی اور بے دردی سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی توجہ اور محنت کا انداہ شہریار کے ان شعروں میں ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ گھر کا مضمون شہریار صاحب کے ذہن پر کچھ زیادہ ہی سوار تھا، شاید اسی لیے اسے کئی پہلوؤں سے باندھنے کی کوشش کی ہے اور ہر بار ایک نیا پہلو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ شہریار کے ان شعر کو ملاحظہ کریں

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہوسکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

ان دنوں تعمیر کی صورت میں جو خرابی در آئی ہے اس نے گھر کے تصور کو تعمیر سے کہیں زیادہ اس کی مسماری کا منظر نامہ پیش کیا ہے۔ گھر کی مسماری اور تباہی کی متعدد صورتیں اور جہتیں ہمارے سامنے ہیں۔ بہت پہلے مصطفیٰ زیدی نے کہا تھا:

انھیں پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

انسانی معاشرہ جن صورت حال سے دو چار ہے اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ دنوں بعد یہ کہنے کے لیے بھی نہیں رہ جائے گا۔ کیونکہ طاقت ور قومیں کمزور قوموں اور ملکوں کو تباہ کرنے کے درپے رہتی ہیں۔ اس کے لیے مختلف حیلے اور حوالے اختیار کیے جاتے ہیں۔ تجارت و معیشت کے ذریعے بھی ملکوں اور قوموں کو غلام بنانے اور ان کی شناخت ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی بعض نظموں میں اس طرف اشاریے کیے ہیں۔ مثلاً

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

احمد محفوظ نے گھر کے مضمون کو بڑی خوبی سے برتا ہے۔ شہر کا نقشہ بدلنا اور پھر اپنے گھر کو دیکھنے کے لیے جانا طنز کی ایک نئی صورت سے اسے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ بہت بلیغ اشارہ ہے۔

سنا ہے شہر کا نقشہ بدل گیا محفوظ
تو چل کے ہم بھی ذرا اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اردو شاعری کے نگار خانے میں لفظ گھر کے استعمال کی مختلف صورتوں کو اس طرح بھی دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔

❑❑❑

غزل

وہ اعلیٰ ظرف تھا، مجھ کو رہا منانے میں
مجھے ہی دیر لگی خول توڑ آنے میں

ذرا سی دیر میں احوال اس نے کھول دیئے
مگر مجھے تو زمانے لگے بتانے میں

میرے وجود میں خوشبو کا شور مت پوچھو
کہ گل کو آیا بڑا لطف ٹوٹ جانے میں

کہ میں نے خوشبو کی تصویر بھی بنا ڈالی
زمانے لگ گئے کردار کو بنانے میں

گذر ہوا کا محل میں محال ہے یارو
سکوں ملے گا ہمیں تو غریب خانے میں

جو ہوسکے تو شہ دین کو بھی پڑھ لینا
کہ اس عمل سے چمک آئے گی گھرانے میں

کچھ اعتبار محبت بھی اب نہیں اصغر
نہ جستجو ہی رہی ان سے دل لگانے میں

محبوب خان اصغر

شاہ اپارٹمنٹ، وجے نگر کالونی، حیدر آباد

9246272721

مجتبیٰ حسن صدیقی

قطب پور، ڈالی گنج، لکھنؤ

8960799850

پیارے صاحب رشیدؔ کی رباعیوں میں مضامین پیری

پیارے صاحب رشیدؔ (۱۸۴۷ء۔ ۱۹۱۸ء) ایک کامیاب مرثیہ گو اور ممتاز رباعی گو شاعر تھے۔ ان کا پورا نام سید مصطفی میرزا، عرفیت پیارے صاحب اور تخلص رشیدؔ تھا۔ میر انیسؔ رشیدؔ کے حقیقی نانا اور میرزا اعشق و تعشقؔ چچا تھے۔ رشیدؔ، انیسؔ اور عشقؔ کی روایات کے امین اور پاس دار تھے، جس کا اندازہ ان کی تخلیقات میں برتے گئے فنی محاسن اور شعری وسائل سے لگایا جا سکتا ہے۔ اردو مرثیے کے حوالے سے ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے مرثیے میں رثائیت کو برقرار رکھتے ہوئے، اس میں تغزل، بہاریہ مضامین اور ساقی نامہ کا تجربہ کیا اور بہترین مرثیے تخلیق کئے۔ رشیدؔ نے مرثیہ اور رباعی کے علاوہ سلام، قصیدہ اور غزل جیسی اصناف کو وسیلۂ اظہار کے طور پر استعمال کیا اور اس میں انفرادیت کی چھاپ چھوڑنے میں کامیابی حاصل کی لیکن اردو ادب میں وہ ایک مستند رباعی گو شاعر کی حیثیت سے زیادہ جانے جاتے ہیں۔ رشیدؔ نے اپنی رباعیوں میں مذہبی، اخلاقی، فلسفیانہ اور ذاتی موضوعات کو پیش کیا ہے۔ ان کے موضوعات روایتی نوعیت کے ہیں جن میں جدت تو نہیں ہے لیکن اپنی زبان و بیان اور طرزِ ادا کے سبب کیف و تاثیر سے مملو ہیں۔ اس لیے ان کو پڑھنے پر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ سلامؔ سندیلوی نے انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے:

> ”رشیدؔ کے موضوعات قدیم ہیں مگر ان میں جدید رنگ ضرور ہے، اور ایک قسم کی تازگی پائی جاتی ہے۔ یہ تازگی ان کو ان کے لطافتِ بیان نے عطا کی ہے۔ یعنی وہی شرابِ کہنہ ہے مگر شیشہ و ساغر بدلے ہوئے ہیں۔ اس لیے مئے نوشی کے وقت کچھ ذائقہ بھی نیا معلوم ہوتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ رشیدؔ کے یہاں ہیں تو وہی باسی پھول مگر کچھ تازہ خوشبو ضرور دیتے ہیں۔“(۱)

ہر قادر الکلام شاعر کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ پامال مضامین کو بھی اپنی قوتِ اختراع اور منفرد انداز بیان کے سبب جدت و ندرت کے احساس سے بھر دیتا ہے۔ سلامؔ سندیلوی نے اسی بات کو شراب و ساغر کے استعارے کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یوں تو رشیدؔ کی رباعیاں مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں مگر رشیدؔ کا خاص موضوع پیری اور اس کے احوال ہیں۔ حالانکہ پیری کے موضوعات پر مشتمل رباعیاں انیسؔ، دبیرؔ، مونسؔ اور اوجؔ وغیرہ کے یہاں بھی ہیں مگر پیری کے متعلق جو مضامین رشیدؔ کے یہاں پائے جاتے ہیں وہ ان کے ماقبل اور مابعد کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتے۔ ایسا لگتا ہے کہ رشیدؔ اس موضوع پر استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔ خنجرؔ لکھنوی نے رشیدؔ کی رباعیوں میں مضامین پیری کے متنوع پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ”الغرض مشاقِ شاعر نے ایک پیری کی آڑ پکڑ کر مختلف مضامین کا ہرا بھرا باغ لگا دیا ہے جہاں قسم قسم اور طرح طرح کے پھول اپنی کیفیتیں دکھا رہے ہیں اور مزہ یہ ہے کہ مضمون بھی پھیکے سیٹھے نہیں بلکہ شعر کی تمام خوبیوں اور محاسن سے مالا مال ہیں۔ زبان کی شیرینی و صفائی، بیان کی سلاست و دلچسپی، طرزِ ادا کی دلفریبی و رنگینی، اسلوب کی دلآویزی و دل کشی اپنی اپنی جگہ جلوہ دکھا رہی ہے۔ دیکھنے والے دیکھتے ہیں اور محو نظارہ ہو جاتے ہیں۔ سننے والے سنتے ہیں اور سر دھننے لگتے ہیں۔“(۲)

خنجرؔ لکھنوی کے یہ خیالات تاثراتی نوعیت کے محسوس ہوتے ہیں لیکن جب ہم رشیدؔ کی رباعیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم انہیں کیفیتوں سے گزرتے ہیں اور زبان و بیان کی انہیں جلوہ طرازیوں سے مسحور ہوتے ہیں جو مذکورہ اقتباس میں بیان کئے گئے ہیں۔ پیری کے موضوع کے حوالے سے گلزارِ رشیدؔ کی تقریظ میں اثرؔ لکھنوی نے جامع تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ”رباعی میں دندان کو بے بہا موتی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ چونکہ موتیوں کو دھاگے میں پرو کے ہار بنایا جاتا ہے لہٰذا ہار کی بقا کا دارو مدار اس دھاگے پر ہے جس میں موتی پروئے ہوئے ہیں۔ اگر وہ دھاگہ ٹوٹ جائے تو موتی بھی بکھر جائیں گے۔ رشیدؔ نے یہاں اسی استدلال کا سہارا لے کر دندان کے ٹوٹنے کا سبب یہ بتایا ہے کہ جس تارِ نگاہ میں دندان کو پرو کر ایک ہار کی شکل میں ڈھالا گیا تھا وہ تار ٹوٹ گیا لہٰذا دندان بھی ٹوٹ گئے۔ یعنی جب نظر کا تار ہی نہ رہا تو گوہرِ دندان کیونکر قائم رہ سکتے ہیں؟ ایسی نادر تعلیلیں اب ناپید ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنی باتوں کو مدلل انداز میں پیش کرنا اور عام تجربات سے نادر نکات دریافت کرنا رشیدؔ کا محبوب مشغلہ ہے۔ دانتوں کے گرنے کے مضمون پر مشتمل ایک اور رباعی ملاحظہ کیجیے۔ اس سے پیشتر رباعی میں رشیدؔ نے دانتوں کے گرنے کا سبب بیان کیا تھا لیکن اس رباعی میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ پیری ہی میں دانت کیوں ٹوٹتے ہیں؟ دانتوں کے ٹوٹنے کا یہ عمل جوانی میں کیوں نہیں ہوتا۔“

> ’’پیری کے مضامین تو گویا حضرتِ رشیدؔ کا حصہ ہو گئے۔ ایک معمولی موضوع میں اتنی اور اس قدر متنوع طرفگی پیدا کرنا حیرت انگیز ہے۔‘‘(۳)

پیری کا موضوع ہے تو معمولی نوعیت کا مگر رشیدؔ نے خلاقانہ قوت کی بدولت اسے غیر معمولی بنا دیا ہے۔ معمولی کو غیر معمولی میں تبدیل کر دینا شاعر کی قادر الکلامی اور معجز بیانی کو ظاہر کرتا ہے۔ رشیدؔ کے یہاں پیری کے موضوع پر مشتمل رباعیاں عموماً دو قسم کی ہیں۔ رباعیوں کی ایک قسم وہ ہے جس میں ایسے مضامین کو پیش کیا گیا ہے جو حسرت و یاس اور ناامیدی و افسوس کی کیفیت سے مملو ہیں یعنی یہ رباعیاں منفی فضا کی تخلیق کرتی ہیں۔ ایسی رباعیوں کی تعداد زیادہ ہے بہ نسبت اس قسم کی رباعیوں کے جس میں ظرافت اور شوخی سے کام لیا گیا ہے۔ یعنی پیری کا بیان ایسے شوخ اور ظریف انداز میں کیا گیا ہے جو رجائیت کی صفت سے مالا مال ہے۔ اس قسم کی رباعیاں پیری کی رگوں میں بھی جوش و امنگ کا جذبہ بھر دیتی ہیں اور مثبت وصحت مند ماحول کی تخلیق کرتی ہیں۔ احوالِ پیری کے متعلق دونوں قسم کی رباعیوں میں صنعتِ حسنِ تعلیل سے جو مضمون آفرینی پیدا کی گئی ہے، وہ شاعر کے عمیق مشاہدے، پختہ تجربے اور زبان و بیان پر قدرتِ کاملہ کی دین ہے۔ پیری کی تمام علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہے کہ بہ سببِ ضعف و ناتوانی انسان کی کمر جھک جاتی ہے، جس کے باعث سر بھی سینے کی طرف جھکا ہوا نظر آتا ہے۔ رشیدؔ نے پیری کی اس علامت کو موضوع بنا کر اپنی رباعیوں میں خاص طور سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے خمیدگیِ کمر سے جو نادر مضامین پیدا کیے ہیں، ان کی مثال بڑی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

کب تک میں رنج و غم کی شدت دیکھوں
تاکہ اپنے پہ یہ مصیبت دیکھوں
گردوں نے پیر کر دیا ہے مجھ کو
خم ہوں کہ بس اب نہ اس کی صورت دیکھوں

درج بالا رباعی میں جھکے ہوئے سر سے رشیدؔ نے شاعرانہ تعلیل پیدا کر لی اور اس کے خم ہونے کی یہ وجہ بتائی کہ چونکہ فلک نے مجھے پیر کر دیا لہٰذا میں اس کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا ہوں۔ یعنی قامت میں جو خم بہ سبب ضعف پیری ہے اسے ناراضی سے تعبیر کر دیا اور اسے منھ پھیرنے کے معنی میں لے لیا، جو سخت ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے بولا جاتا ہے۔ ’پیرِ فلک‘ کی ترکیب کے تناظر میں گردوں اور پیر کی رعایت سے بھی محظوظ ہوا جا سکتا ہے۔ خمیدگیِ کمر کے ایک اور نادر پہلو کو ملاحظہ کیجیے:

پیری میں سفر عدم کا اک آفت ہے
جانا ہے دور ضعف میں دقت ہے
بے وجہ جھکا ہوا نہیں ہوں میں رشیدؔ
پاؤں سے پوچھتا ہوں کچھ طاقت ہے؟

شاعرانہ تعلیل کے لحاظ سے تو یہ رباعی اہم ہے ہی ساتھ ہی لکھنوی تہذیب اور رشیدؔ کی خاکساری کی بھی بھرپور عکاسی کر رہی ہے۔ جھک کر پوچھنا لکھنؤ کے معاشرتی نظام میں اخلاقی اقدار کے بلند مقام کو ظاہر کرتا ہے۔ خمیدگیِ کمر کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرنے کے لیے رشیدؔ نے صرف سنجیدہ اسلوب ہی کو نہیں اپنایا بلکہ قدرے شوخی و ظرافت سے بھی کام لیا ہے۔ کمر کا جھکنا صرف تاسف اور ناامیدی میں مبتلا نہیں کرتا ہے بلکہ کہیں کہیں ان کی یہ جھکی ہوئی کمر ان کے حصے میں وردان ثابت ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

دنیا سے سبھی برے بھلے جائیں گے
کیا خلق سے جز گناہ لے جائیں گے
پیری سے ہیں خم حشر میں دیکھے گا کون
جنت میں جھکے جھکے چلے جائیں گے

مضمون سے قطع نظر اس کی ایک خوبی چوتھے مصرعہ کا محاکاتی وصف سے مملو ہونا ہے۔ جب ہم ’جھکے جھکے چلے جائیں گے‘ پڑھتے ہیں تو ہمارے سامنے کوئی جھکا جھکا چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ رشیدؔ نے خمیدگیِ کمر کو ایک اور پہلو سے اپنے لیے مفید ثابت کیا ہے۔ ان کے نزدیک کائنات کی تفہیم کے لیے اشیاء اور مادے کا عمیق مطالعہ لازم ہے۔ اور یہ سنہری موقع خمیدگیِ کمر کے سبب مجھے عنایت ہوا ہے:

پیری نے جھکایا ہے سفر کرتا ہوں
سب اہلِ زمیں کو یہ خبر کرتا ہوں
عالم کو جو خوب دیکھنا ہے منظور
ذرے ذرے پہ میں نظر کرتا ہوں

مطالعۂ کائنات میں مستغرق رہنے کے باوجود رشیدؔ اپنی ذات کو فراموش نہیں کرتے بلکہ جھکی ہوئی کمر سے اپنے پیروں کی نگرانی کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں تاکہ وہ رہِ راست پر جمے رہیں۔ منفی صورتِ حال کو مثبت ماحول میں تبدیل کرنا رشیدؔ کا خاصہ ہے۔ رباعی ملاحظہ کیجیے:

پیری سے گو جھکا ہوا چلتا ہوں
جو راست ہے وہ راستہ چلتا ہوں
اب تو نہ رہِ ثواب سے ہٹ جائیں
اپنے پیروں کو دیکھتا چلتا ہوں

دوسرے مصرعے میں راست اور راستہ میں صنعتِ اشتقاق سے محظوظ ہوا جا سکتا ہے۔

بالوں کا سفید ہونا بھی پیری کی ایک علامت ہے۔ جس میں سر اور داڑھی کے بال سفید ہو جاتے ہیں۔ رشیدؔ نے اس حوالے سے بھی نادر مضامین کی تخلیق کی ہے اور ایسے ایسے نکات بیان کئے ہیں جن کو سمجھ کر ان کے فن پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔ ان رباعیوں میں رشیدؔ نے جو پیرایہ اختیار کیا ہے اس پر غزلیہ رنگ و آہنگ کا غلبہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایک رباعی ملاحظہ کیجیے:

بالوں کی سفیدی سے عیاں ہے پیری
ہنگامِ فراقِ جسم و جاں ہے پیری
کس طرح نہ ہو غنچۂ دل پژمردہ
گلزارِ شباب کی خزاں ہے پیری

پھولوں کی کمھلاہٹ اور جسم کی جھریاں دیکھنے میں ایک جیسی نظر آتی ہیں۔ اسی لیے رشیدؔ نے پیری کو گلزارِ شباب کی خزاں سے تعبیر کیا ہے۔ رشیدؔ نے بعض رباعیوں میں فن سپہ گیری اور میدانِ جنگ کے تلازموں کو بروئے کار لاتے ہوئے پیری و جوانی کو باہم متحارب اور برسرِ پیکار دکھایا ہے:

ہے موئے سفید شان و اوجِ پیری
دریائے شباب میں ہے موجِ پیری
سرکردۂ لشکرِ جوانی ہشیار
سر پر آیا نشانِ فوجِ پیری

دوسرے مصرعے میں شباب اور پیری کی جو تشبیہیں دی گئیں ہیں اور ان سے جو پیکر تخلیق ہوا ہے، وہ بے مثال ہے۔ دریا چونکہ اپنی رنگت کے اعتبار سے کالے رنگ کے قریب ہوتا ہے اور جوانی میں سر کے بال بھی کالے ہوتے ہیں لہٰذا دریائے شباب کی ترکیب صناعی و معنوی خصوصیت سے پر ہے۔ سیاہ بالوں میں ایک سفید بال کا ہونا پیری کی آمد کی علامت ہے۔ تیسرے مصرعے میں بالوں کی سیاہی کو ’سرکردۂ لشکرِ جوانی‘ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس کو تنبیہ کی گئی ہے کہ فوجِ پیری کا ایک سپاہی جوانی کے گھیرے کو توڑنے میں کامیاب ہو گیا ہے اگر وقت رہتے اس کا تدارک نہ کیا گیا تو جلد ہی یہ لشکرِ جوانی کا صفایا کر دے گا۔ رشیدؔ نے کئی رباعیوں میں بالوں کے سفید ہونے کا سبب بھی بتایا ہے۔ عام طور سے جوانی کے رخصت ہونے اور پیری کے آنے کو اس کا سبب تصور کیا جاتا ہے مگر رشیدؔ نے شاعرانہ تعلیل کا سہارا لیتے ہوئے اس کا جو سبب بیان کیا ہے وہ دلچسپی کا مظہر تو ہے ہی ان کے پروازِ تخیل کی بلندی کو بھی ظاہر کرتا ہے:

مجنوں میں ہوں شباب اگر لیلیٰ ہے
صبحِ پیری جو ہے تو دل میلا ہے

ہے ریش سفید موئے سر بھی ہے سفید
آنکھوں کا نور جا کے یوں پھیلا ہے

پہلے مصرعے میں شباب کو لیلیٰ یعنی معشوق اور خود کو مجنوں یعنی عاشق سے تعبیر کیا ہے۔شباب کو لیلیٰ سے تشبیہ اس لیے دیا ہے کہ لیلیٰ کالی رنگت والی تھی۔(کالی رنگت ہونے کے سبب ہی اسے لیلیٰ کہتے تھے کیونکہ لیل عربی لفظ ہے جس کے معنی رات کے ہیں)۔صبحِ پیری کی ترکیب بھی تشریح طلب ہے۔چونکہ صبح اور پیری دونوں کی علامت سفیدی ہوتی ہے لہٰذا صبحِ پیری سے مراد پیری کی سفیدی یعنی بالوں کا سفید ہونا ہے۔دل میلا ہونا محاورہ ہے جس کے معنی دل کا اداس ہونا یا رنج وغم سے پر ہونا ہے۔چوتھا مصرعہ خاص توجہ کا طالب ہے۔چونکہ پیری میں بصارت زائل ہو جاتی ہے اور بصارت کی علامت بھی سفیدی ہوتی ہے لہٰذا رشیدؔ نے یہ تعلیل پیدا کی کہ یہ جو سر اور داڑھی کے بال سفید نظر آتے ہیں دراصل یہ بصارت کی سفیدی ہے جو آنکھوں سے نکل کر سر اور داڑھی کے بالوں پر پھیل گئی ہے۔تلمیح، استعارہ، تشبیہ اور حسنِ تعلیل سے مزین یہ رباعی رشیدؔ کی خلاقانہ شان کا مظہر ہے۔

پیری میں جہاں کمر جھک جاتی ہے اور بال سفید ہو جاتے ہیں وہیں دانت بھی گر جاتے ہیں۔دانتوں کا گر جانا پیری کی تمام واضح علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔رشیدؔ نے اس علامت کو بھی موضوع بنا کر متعدد رباعیاں کہی ہیں۔یہ رباعیاں بھی حسنِ تعلیل کی عمدہ مثالوں سے بھری ہوئی ہیں۔ایک رباعی ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے دانتوں کے گر جانے کا عجیب سبب بیان کیا ہے:

مشہور تھی آب و تاب جن کی نہ رہے
پائے تھے جو بے بہا موتی نہ رہے
کب تارِ نگاہ میں بندھے تھے دنداں
جب وہ نہ رہا رشیدؔ، یہ بھی نہ رہے

اس رباعی میں دندان کو بے بہا موتی سے تشبیہ دی گئی ہے۔چونکہ موتیوں کو دھاگے میں پرو کے ہار بنایا جاتا ہے لہٰذا ہار کی بقا کا دارومدار اس دھاگے پر ہے جس میں موتی پروئے ہوئے ہیں۔اگر وہ دھاگہ ٹوٹ جائے تو موتی بھی بکھر جائیں گے۔رشیدؔ نے یہاں اسی استدلال کا سہارا لے کر دندان کے ٹوٹنے کا سبب یہ بتایا ہے کہ جس تارِ نگاہ میں دندان کو پرو کر ایک ہار کی شکل میں ڈھالا گیا تھا وہ تار ٹوٹ گیا لہٰذا دندان بھی ٹوٹ گئے۔یعنی جب نظر کا تار ہی نہ رہا تو گوہرِ دندان کیونکر قائم رہ سکتے ہیں؟ ایسی نادر تعلیلیں اب ناپید ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ اپنی باتوں کو مدلل انداز میں پیش کرنا اور عام تجربات سے نادر نکات دریافت کرنا رشیدؔ کا محبوب مشغلہ ہے۔دانتوں کے گرنے کے مضمون پر مشتمل ایک اور رباعی ملاحظہ کیجیے۔اس سے پیشتر رباعی میں رشیدؔ نے دانتوں کے گرنے کا سبب بیان کیا تھا لیکن اس رباعی میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ پیری ہی میں دانت کیوں ٹوٹتے ہیں؟ دانتوں کے ٹوٹنے کا یہ عمل جوانی میں کیوں نہیں ہوتا:

طفلی میں جو تھا وہ دل ہمارا نہ رہا
بعد اس کے شباب کا سہارا نہ رہا
فصلِ پیری میں دانت سب ٹوٹ گئے
آئی جو سحر تو کوئی تارا نہ رہا

اس رباعی میں دندان کو رنگت اور چمک کے سبب تاروں سے تشبیہ دی گئی ہے اور پیری و سحر کو بہ سببِ سفیدی ایک دوسرے کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔جس طرح صبح ہوتے ہی تارے معدوم ہو جاتے ہیں اسی طرح پیری کے آتے ہی دندان بھی گر گئے۔یعنی دانت عہدِ پیری میں اس لیے گرتے ہیں کیونکہ پیری شبِ عمر کی صبح ہے۔لہٰذا صبح کو تاروں کا معدوم ہو جانا نظامِ قدرت ہے۔اس رباعی میں عمر کے مختلف مراحل میں مختلف کیفیتوں اور تبدیلیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

بالوں کی سفیدی، دانتوں کا گرنا اور کمر کا جھک جانا، پیری کی واضح علامتیں ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی بصارت کا زائل ہونا، سماعت کا کمزور ہونا، ذائقے کا بگڑ جانا، گویائی میں اشکال پیدا ہو جانا، دل کا یاس و ناامیدی میں مبتلا رہنا اور تمام اعضاء پر ضعف طاری رہنا بھی پیری کی نشانیوں میں سے ہے۔رشیدؔ نے مختلف رباعیوں میں پیری کی ان نشانیوں کو علاحدہ علاحدہ بیان کرنے کے ساتھ ہی کبھی کبھی دو، چار نشانیوں کو ایک ہی رباعی میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔پیری میں ضعف و نقاہت کے سبب حرکت و عمل سے بیزاری تو ہو ہی جاتی ہے، اٹھنا بیٹھنا اور چلنا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔پیری کی اسی صورت کو بیان کرتی ہوئی رشیدؔ کی یہ رباعی ملاحظہ کیجیے:

پیری میں ہوئے ہیں سفری کی صورت
چلتے ہیں نسیمِ سحری کی صورت
ہم بیٹھتے ہیں غبارِ خاطر کی طرح
اٹھتے ہیں دردِ جگری کی صورت

مثالوں اور تشبیہوں سے سجی یہ رباعی پیری کی اس ناگفتہ بہ حالت کو بھی دلچسپ بنا دیتی ہے۔نقاہت کے سبب انسان کیسے اٹھتا، بیٹھتا اور چلتا ہے رشیدؔ نے اس کا نقشہ بہت بلیغ انداز میں کھینچا ہے۔اس کے علاوہ پیری میں تکلم کی دشواری اور زبان لڑکھڑانے کے مضمون کو رشیدؔ نے اس طرح برتا ہے:

بالوں کی سیاہی آہ ہیہات گئی
کہتے ہیں جوانی جسے وہ رات گئی
پیری نے زباں کی فصاحت کھو دی
لو صبح ہوئی رات گئی بات گئی

چونکہ پیری میں انسان ملیح نہیں رہتا یعنی اس کا نمک ختم ہو جاتا ہے اور فصاحت کو خوانِ تکلم کا نمک کہا جاتا ہے لہٰذا پیری کے سبب زباں کی فصاحت بھی جاتی رہی۔چوتھے مصرعے میں 'رات گئی بات گئی' کے تخلیقی استعمال نے رباعی کے معنوی امکانات کو وسیع تر کر دیا ہے۔رباعیوں میں ضرب المثل یا محاوروں کا استعمال محض چونکانے کے لیے کیا جاتا ہے لیکن رشیدؔ نے اس میں تہہ داری پیدا کرتے ہوئے اسے بنیادی خیال کا نچوڑ بنا کر پیش کیا ہے۔پیری میں قوتِ گویائی کے علاوہ قوتِ باصرہ پر بھی حرف آ جاتا ہے۔دور کی نظر کے ساتھ ہی نزدیک کی نظر بھی متاثر ہو جاتی ہے۔ایک رباعی ملاحظہ کیجیے:

طفلی تو گئی دور اسے کیا جانیں ہم
پائیں نہ کہیں خاک بھی گر چھانیں ہم
پیری نے یہ حال کر دیا آنکھوں کا
مل جائے جوانی تو نہ پہچانیں ہم

اس جائزے کے بعد بحیثیتِ مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ رشیدؔ کے یہاں پیری اور علاماتِ پیری کے متنوع مضامین میں تشبیہ، استعارہ، حسنِ تعلیل، محاورہ، روزمرہ اور ضرب المثل وغیرہ کی ایک کہکشاں آباد ہے۔زبان کی سطح پر ان کی رباعیاں سلیس و رواں تو ہیں ہی تنافر و تعقید سے بھی پاک ہیں۔تکرارِ مضمون بھی بہت کم ہی نظر آتا ہے۔علاماتِ پیری کے متعلق رباعیات پڑھنے پر بوریت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ تجسس کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ہم اس شوق و امید کے ساتھ دوسری رباعی کی طرف بڑھتے ہیں کہ یہ رباعی بھی گزشتہ رباعیوں کی طرح جدت و ندرت کی حامل ہوگی اور ہمیں حیرت و استعجاب کی کیفیت میں مبتلا کر دے گی۔ہماری یہ امید ہر گزرتی ہوئی رباعی کے ساتھ فزوں تر ہوتی جاتی ہے۔

حوالہ جات:

(۱)۔اردو رباعیات، سلام سندیلوی، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۶۳، ص: ۴۰۸۔۴۰۹
(۲)۔رباعیاتِ رشیدؔ، مرتب: فدا علی خنجر لکھنوی، محبوب المطابع برقی پریس دہلی، ۱۹۲۹، ص: ۴۲
(۳)۔گلزارِ رشیدؔ (جلد اول)، مرتب: مہذب لکھنوی، نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۵۱، ص: ۳۰

❑❑❑

عبدالقادر

شعبہ اردو خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی لکھنؤ

9807202855

افتخار عارف کی شاعری میں کربلا

واقعہ کربلا محض اسلامی تاریخ کی اہم منزل نہیں ہے جس نے اس خیال کو مستحکم کیا کہ" حقا کہ بنائے لاالہ ہست حسین " بلکہ اس نے انسانی عظمت اور معاشرے کی بلندی کے ایسے حقائق پیش کر دیے جن پر عمل کر کے آج بھی حق و انصاف ،شر کے مقابلہ میں خیر اور ذلت کی زندگی سے نجات حاصل کر کے عزت کی موت کو ترجیح دینے کا شعور پیدا ہوتا ہے ۔یہی سبب ہے کہ کوئی شعبۂ حیات اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ شعراء کو جب اپنی شاعری کے ذریعہ مظلوم کی آواز بلند کرنے اور انسانیت کے اور اصولوں کی تبلیغ کے لیے کوئی مثال تلاش کرنی پڑی تو انہیں صرف واقعات کربلا کا سہارا ملا۔ اردو شعراء نے عوامی زندگی کے غم، مصائب اور انفرادی شرائد وا کلام سے سکون حاصل کرنے کے لیے اس واقعہ کو مثال بنا کر پیش کیا، کبھی واضح طور پر کبھی علامات کے ذریعہ اگر ایک طرف مرثیہ گو شعراء نے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے اپنے فن کو ذریعہ بنایا تو دوسری طرف غزل گو شعراء نے بھی اپنے اشعار میں اس واقعہ پر اشارے کر کے انسانی شعور کو بیدار کرنے پر توجہ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری کی ابتدائی منزل سے آج تک اس واقعہ کو کسی نہ کسی شکل میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ خاص طور پر جب انسانیت پر ظلم و جبر کی قوتیں حاوی ہوتی رہی ہیں ۔اردو کے کلاسیکی ادب میں سانحۂ کربلا کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے اس لیے اردو شاعری میں کربلا کے موضوع کو جتنی اہمیت حاصل دی گئی ہے اس کی مثال کسی دوسری زبان میں ملنا مشکل ہے اردو ادب کی تاریخ اس سانحۂ کے بغیر نامکمل ہے ۔واقعہ کربلا نے اردو شاعری کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ اردو کے کئی اصناف تو واقعہ کربلا کے بغیر نامکمل ہے جن میں مرثیہ، سلام، نوحہ، اور منقبت نہایت ہی اہم ہیں ۔

> ’’واقعہ کربلا ظالم و جابر حکومتوں کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے اس لیے کربلا اور اس کی تعلیقات کے استعمال سے مابعد جدید شاعری میں اس کا اظہار بطور احتجاج دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ احتجاج انسانی صورتحال کے خلاف بھی ہے اور سیاسی و جبر وتشدد کے خلاف بھی۔ مابعد جدید غزل میں سانحۂ کربلا کی اشاریت کا دخول کسی خارجی دباؤ کے باعث نہیں ہے بلکہ آج ہر انسان کے اندر ایک کربلا بسی ہوئی ہے۔ کربلا میں اخلاقی و روحانی اقدار ، رشتوں کی پاسداری دوستوں اور غیروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور دیگر ساری انسانی قدریں اپنے معراج پر نظر آتی ہیں لیکن معاصر عہد میں یہ سب ختم ہو رہا ہے اور انسان کربلائے عصر میں بالکل تنہا کھڑا ہے۔ اس کے پاس انسانی اقدار کا سرمایہ بھی نہیں ہے تو ایسے میں سانحہ کربلا کی اشاریت غزل میں داخل ہو رہی ہے تو حیرت کی بات نہیں ہے۔‘‘

اردو شاعری کی ارتقائی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جدید اردو شاعری کا آغاز مولانا الطاف حسین حالی سے ہوا جسے اقبال اور فیض نے بام عروج تک پہنچایا۔ جہاں تک جدید نظم کے ابتدائی سفر، عہد وسطیٰ اور عہد حاضر کا تعلق ہے تو ان تمام سفری مراحل کی منزلیں ن ۔م ۔راشد کے نام پر آ کر رک جاتی ہیں ۔اور 1970 ء کے بعد نمودار ہونے والے ممتاز شعراء میں افتخار عارف کی اہمیت مسلم ہے، انھوں نے شعر و ادب میں طرز احساس اور فکر و فن کے نئے جہات و ابعاد روشن کیے ہیں وہ قابل دید ہیں ۔انھوں نے اردو غزل کی قدیم روایات سے اپنا رشتہ استوار کرتے ہوئے خیال، اسلوب، دونوں سطح پر غزل میں نئے مضامین اور لفظیات کے ایسے ایسے تجربے کیے ہیں جو نئی نسل کے شعراء کو ایک نئے احساس اور نئے ذائقے کا پتہ دیتے ہیں ۔افتخار عارف جدید اور مابعد جدید شعراء کے ہجوم میں اپنے اسلوب، لہجے کی انفرادیت، آہنگ، نئی ترکیبوں اور استعاروں، خیال کی بندش اور الفاظ کی پرقوت اور تخلیقی استعمال کے باعث اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں ۔ان کی شاعری میں ہجرت، عصری آگہی ، وقت کا جبر، رشتوں کا کرب، ظالم و جابر طاقتوں کے خلاف احتجاج اور علامت کربلا کا علامتی اظہار بھرپور انداز میں کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک منفرد اور بڑا وصف ان کا اپنا اسلوب ہے۔ اچھوتی اور نئی نئی ترکیبوں، لفظوں کے انتخاب اور خوش رنگ تشبیہوں نے ان کے اسلوب کو اس حد تک منفرد کر دیا ہے کہ اسے دوسرے شعراء کے درمیان با آسانی پہچانا جا سکتا ہے ۔اچھے اور کامیاب شاعری کی شناخت و خوبی یہی ہے کہ اس کا اسلوب وہ نہ ہو جو اس کے پیش رووں نے یا اس کے ہمعصر شعراء سے مماثلت رکھتا ہو اور ہر عہد میں وہی شاعر اپنی شاعری کی شناخت رکھتا ہے ۔افتخار عارف کی شاعری میں جاذبیت ہے اس کی وجہ ان کا اسلوب ہے ۔اسلوب کی اس خوبی نے ان کی شاعری میں ایک ایسی فضا قائم کر دی ہے جو جگنوؤں کی طرح روشنی دیتی ہے ۔افتخار عارف نے کلاسیکی غزل کی مانوس روایت سے استفادہ بھی کیا ہے اور وہ الفاظ جو غزل کے لیے نامانوس تھے انھیں بڑی ہنرمندی اور خوبصورتی کے ساتھ غزل میں برتا ہے ۔

انھوں نے خود کو جدید غزل کے موضوعات تک ہی محدود نہیں کیا بلکہ اپنے عہد کی صورتحال کو بیان کرنے کے لیے کلاسیکی لفظیات، تراکیب و استعارات کو جس خوبی سے برتا ہے اس کی دوسری مثال اس عہد کے شعراء کے یہاں مفقود ہے۔ انھوں نے کلاسیکی غزل کی روایت سے رشتہ برقرار رکھتے ہوئے ان عناصر کو اپنی شاعری میں داخل کیا جنھیں ہم آفاقیت کا نام دے سکتے ہیں۔ سانحۂ کربلا کو استعارے کے طور پر نئی غزل میں اہمیت تو دی جا رہی تھی تاہم مابعد جدید غزل میں اہم روایت کی صورت اختیار کر گیا۔ کیونکہ مابعد جدید غزل میں اس موضوع کا اظہار علامت کے طور پر ہوا ہے مابعد جدید غزل گو شعراء میں افتخار عارف نے خصوصیت کے ساتھ اور مستقل مزاجی و تسلسل کے ساتھ سانحۂ کربلا کو بطور استعارہ پیش پیش کیا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے اپنی اہم کتاب سانحہ کربلا میں کہا ہے کہ:

واقعہ کربلا ظالم و جابر حکومتوں کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے اس لیے کربلا اور اس کی تعلیقات کے استعمال سے مابعد جدید شاعری میں اس کا اظہار بطور احتجاج دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ احتجاج انسانی صورتحال کے خلاف بھی ہے اور سیاسی و جبر و تشدد کے خلاف بھی۔ مابعد جدید غزل میں سانحہ کربلا کی اشاریت کا دخول کسی خارجی دباؤ کے باعث نہیں ہے بلکہ آج ہر انسان کے اندر ایک کربلا بسی ہوئی ہے۔ کربلا میں اخلاقی و روحانی اقدار، رشتوں کی پاسداری دوستوں اور غیروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور دیگر ساری انسانی قدریں اپنے معراج پر نظر آتی ہیں لیکن معاصر عہد میں یہ سب ختم ہو رہا ہے اور انسان کربلائے عصر میں بالکل تنہا کھڑا ہے۔ اس کے پاس انسانی اقدار کا سرمایہ بھی نہیں ہے تو ایسے میں سانحہ کربلا کی اشاریت غزل میں داخل ہو رہی ہے تو حیرت کی بات نہیں ہے۔ اور دوسری طرف جب انسان اپنے اطراف میں نظریں دوڑاتا ہے تو اس کو چاروں طرف شہر کوفہ و شام، نظر آتا ہے ایسے حالات میں شاعر موجودہ صورتحال کے خلاف نبرد آزما بھی ہوتا ہے اور احتجاج بھی کرتا ہے اور آنے والے زمانے میں موجدہ صورتحال کی تبدیلی کی بشارت بھی دیتا ہوا نظر آتا ہے مثلاً:

اب بھی توہین اطاعت نہیں ہوگی ہم سے
دل نہیں ہوگا تو بیعت نہیں ہوگی ہم سے

افتخار عارف

گوپی چند نارنگ کے متذکرہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افتخار عارف نے واقعہ کربلا سے نہ صرف استفادہ کیا ہے بلکہ دوسرے شعراء کے مقابلے اس واقعہ سے حق طلبی اور دردمندی کے نئے نئے پہلو آشکار کیے ہیں۔ کلاسیکی شعراء اور معاصرین نے بھی واقعہ کربلا کا استعمال کیا ہے لیکن افتخار عارف نے واقعہ کربلا اور اس کے متعلق الفاظ اور علامتوں کا استعمال معاصر عہد کی صورت حال کو اجاگر کرنے میں نہایت موثر ڈھنگ سے کیا ہے۔ لشکر، نوک سناں، سر، قاتل، مقتول، پیاس، زنجیر، دشت، شام، گھرانا، خنجر، خیمہ، لشکر، سیاہ شام وغیرہ الفاظ کی مدد سے انھوں نے ظالم حکومتوں کے جور و استبداد اور ان کی سفاکیوں کو قارئین پر عیاں کیا ہے اور ان الفاظ کے پردے میں معانی و مفاہیم کی ایک نئی دنیا آباد کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خلق نے ایک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوک سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رن پڑتا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے
کھلا جو روزن زنداں تو تیر آنے لگے
اب ان فضاؤں میں تازہ ہوا نہ مانگے کوئی
بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

☆

طلق نے اک نظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
لوک سناں پہ سورتیں دیکھا بہت دنوں سے
وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رن پڑتا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے
کھلا جو روزن زنداں تو تیر آنے لگے
اب ان فضاؤں میں تازہ ہوا نہ مانگے کوئی
بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی
سپاہ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے پروردگار شب نکلا
سوال بیعت پر شمشیر جواز بہت
مگر جواب وہی معتبر حسین کا ہے

اردو شاعری میں کربلا کا حوالہ ایک ہمہ گیر استعارے کے طور پر سامنے آیا ہے۔ کربلا کا استعارہ صرف مذکورہ واقعے تک محدود نہیں رہتا بلکہ ہر نوع کے جبر و استبداد کے خلاف ''کلمۂ حق'' کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ شعری رویہ اور علامت دنیا بھر میں نسل انسانی کے حوالے سے ہر طرح کے استحصالی فکر و عمل کے خلاف نعرۂ جہد و عمل بن کر نمودار ہوتا ہے۔ افتخار عارف کے ہاں بھی سانحہ کربلا اسی ہمہ گیری اور اثر آفرینی کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ ان کے اس شعری رویے کے حوالے سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''افتخار عارف کے ہاں یہ رجحان ایسی محویت اور تخلیقی شان سے اظہار پذیر ہوا ہے کہ اس کے شعری شناخت نامے کا ناگزیر حصہ بن گیا ہے۔۔۔۔ واقعہ کربلا اور اس کے تعلیقات کا نئے سماجی انسانی مفاہیم میں استعمال یوں تو اَوروں کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن افتخار عارف کے تخلیقی وجدان کو اس سے جو گہری مناسبت ہے، اس کی نئی شاعری میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ افتخار عارف کے یہاں یہ بات اُن کے تخلیقی عمل کے بنیادی محرک کا درجہ رکھتی ہے کہ وہ لمحہ موجود کی پیچیدہ سیاسی، سماجی، اخلاقی اور انسانی صورتِ حال کو ایک وسیع تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں۔''

افتخار عارف کے چار شعری مجموعے "مہر دو نیم" 1983ء دوسرا مجموعہ "حرف بار یاب" 1994ء تیسرا مجموعہ "جہان معلوم" 2005ء اور چوتھا "شہر علم کے دروازے پر" 2006ء میں منظر عام پر آئے اور "کلیات دل و دنیا" کے نام سے 2009ء میں شائع ہوا۔

افتخار عارف کے شعری سفر کو قید نہیں کیا جا سکتا۔ بفضل خدا وہ باحیات ہیں اور آگے بھی ان کا شعری سفر پوری آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ افتخار عارف کی مجموعی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ ان کی شاعری کا سب سے مضبوط حوالہ واقعہ کربلا ہے۔ افتخار عارف نے واقعہ کربلا کو بطور علامت اپنی شاعری میں مستقل طور پر موضوع بنایا۔ انھوں نے واقعہ کربلا کو مختلف سطحوں پر پیش کیا ہے ان کے معاصرین نے بھی علامت کربلا میں عصری معنویت

پیدا کرنے کی کوشش کی ہے افتخار عارف نے پہلی بار اس نوع کی شاعری میں تہہ دار اور کثیر الجہات معانی ومفاہیم کی ترجمانی کی ہے۔افتخار عارف نے علامت کربلا میں زنداں، نوک سناں، سر، قاتل، مقتول، دشت، زنجیر، پیاس، مشکیزہ، سجدہ، شمشیر، رن، دریا، ڈھالیں، خون، لہو، نیزہ، دمشق مصلحت، قافلہ بے نوا، پیکان ستم وغیرہ جیسے لفظیات اور تراکیب کثرت سے استعمال کی ہیں۔ یہ علامتیں کلاسیکی شاعری میں پہلے ہی سے موجود ہیں لیکن افتخار عارف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف ان علامتوں کی معنویتوں میں اضافہ کیا بلکہ ان میں وسعت پیدا کر کے انہیں ہمارے عہد کے موضوعات ومسائل کی ترجمانی کے لئے استعمال کیا ہے۔وہ بار بار سانحۂ کربلا کے تناظر میں ظلم کے خلاف مزاحمت واحتجاج جبر وتشدد اور استحصالی قوتوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔انھوں نے اپنی غزلوں میں کربلا کے استعارے کو اپنے عہد کے حوالے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔غزلوں کے علاوہ افتخار عارف نے حمد، نعت، منقبت، سلام وغیرہ کثرت سے کہے ہیں اور اس کی مقبولیت واعتباریت بخشی ہے ان کا مجموعہ " شہر علم کے دروازے پر" منقبتی شاعری پر مشتمل ہے جس میں حمد، نعت، منقبت، سلام وغیرہ کے بہترین نمونے ہیں۔اس مجموعے کا بنیادی موضوع مدح رسول اور اہلبیت رسول ہے۔

افتخار عارف بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انکی نظمیں بھی معاصرین میں منفرد پہچان رکھتی ہیں۔افتخار عارف کی نظمیں روایت اور تہذیب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں۔انھوں نے اپنی زیادہ تر نظموں کے مواد کو تاریخ اسلام اور روایت کے باطن سے اخذ کیا ہے۔کربلا اور اس کے متعلقات سے پھوٹنے والی روشنی ان کی نظموں میں جا بجا روشنی بکھیر رہی ہے۔وہ اپنی آنکھوں میں موضوعاتی سطح پر کربلائی استعارے سے استفادہ کرتے ہوئے عصر حاضر کے سیاسی حالات کو پیش کرتے ہیں وہ کبھی اسکے ذریعہ بین الاقوامی حالات کو موضوع بناتے ہیں اور کبھی ذاتی کرب کو بیان کرتے ہیں۔تاریخی اور تہذیبی مسائل، عصری زندگی کے آلام اور ان کی جبریت، ذاتی اور شخصی رویے افتخار عارف کی نظموں کے بنیادی موضوعات ہیں۔بارہواں کھلاڑی، محبت کی ایک نظم ہے، ایک رخ، اور ہوا چپ رہی ان دونوں موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔

افتخار عارف کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی متعدد نظموں کا معنوی آہنگ فرد کی تنہائی اور بے بسی ہے۔فرد کی یہ تنہائی اپنے اندر افراتفری زندگی کے ساتھ اجتماعی طرزِ احساس کے قرینے بھی رکھتی ہے۔ان کے یہاں تنہائی کی معنوی تعمیر کسی منفی طرزِ اظہار کی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ یہ تہذیبی روایت میں فرد کی خاکساری اور عاجزی کی گواہ بن جاتی ہے۔

افتخار عارف کی نظموں میں تخص الفاظ اور اس کا فنی اور جمالیاتی استعمال ایسا موسیقیت کا تاثر پیش کرتا ہے جو دل و دماغ کو خوشگوار رویوں سے آشنا کر دیتا ہے۔ افتخار عارف کی نظموں میں لفظ اپنی تہذیبی اور معنوی روایت سے عکس انداز ہوتا ہے تو اس کا معنوی نظام مدینہ، نجف اور کربلا تک کے زمانوں پر محیط ہو جاتا ہے۔اور اپنے اندر صرف تاریخ کی معنویت کو نہیں سمیٹتا بلکہ اس میں پوری تہذیبی معنویت اپنی تمام تر روایتی جمالیات کے ساتھ منعکس ہو جاتی ہے آخیر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ افتخار عارف کی شاعری زندگی کی بولتی قدروں کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہوئے اپنے لہجہ کی الگ پہچان بنائی ہے۔ان کے لہجے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا اپنا منفرد اور پراعتماد لہجہ ہے ان کے کینوس کے نئے رنگ تازہ کاری اور موضوعاتی تنوع اس تجرباتی عمل کا ثمرہ ہے۔ان کی شاعری اپنے فکری نظام اور فنی اہتمام کے باعث علیحدہ شناخت رکھتی ہے۔اور یہ افتخار عارف کا سب سے بڑا وصف ہے۔

حسین تم نہیں رہے تمہارا گھر نہیں رہا
مگر تمہارے بعد ظالموں کا ڈر نہیں رہا

❑❑❑

غزل

یہ ہوا، یہ فضا ہمہ تن گوش
ساری خلق خدا ہمہ تن گوش

قصۂ غم سنا رہا تھا کوئی
سارا ماحول تھا ہمہ تن گوش

اتنا دلگیر تھا فسانۂ زیست
دیر تک میں رہا ہمہ تن گوش

ہو رہی تھی کہیں اذانِ فجر
اور تھی بادِ صبا ہمہ تن گوش

بارہا تو سنا چکا ہے دل
کون ہو اب بھلا ہمہ تن گوش

کیا خموشی بھی بولتی ہے سلیم
شہر کیوں ہوگیا ہمہ تن گوش

سلیم سرفراز
مسدّی محلہ، آسنسول، مغربی بنگال
9378291891

الماس احمد انصاری

لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

8543035986

اکبرؔ الہ آبادی کی قومی و اصلاحی شاعری

اردو ادب کی تاریخ میں لسان العصر اکبرؔ الہ آبادی (۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء) کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اکبرؔ جس عہد میں شاعری کر رہے تھے اس عہد کو ہندوستانی تاریخ میں سیاسی، سماجی، ادبی اور مذہبی کشمکش کا نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سماج کے حساس لوگ اُن نامساعد حالات کو شدت سے محسوس کر رہے تھے اور حتی الوسع اپنے ردعمل کا اظہار بھی کر رہے تھے، اس عہد میں سماج کے متعدد شعبوں میں عملی ونظری رجحانات اور تحریکات نے جنم لیا۔ لیکن اس عہد سے متعلق اکبرؔ کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فکری ردّعمل کے ذریعہ قوم کو نووارد منفی اثرات قبول کرنے کے تئیں آگاہ اور بیدار کیا اور ہندوستانیت میں مغربیت کی شمولیت سے پیدا ہونے والے مضر اثرات پر توجہ دلائی، وہ کسی خاص نقطۂ نظر یا تحریک کے ترجمان نہیں تھے بلکہ ملک، قوم، مذہب اور ہندوستانی معاشرت کو متاثر کرنے والی ہر شئے ان کے یہاں اصلاحی تنقید کا نشانہ بنی۔ جیسا کہ 'انتخاب اکبر آبادی' کے 'تعارف' میں صدیق الرحمن قدوائی رقمطراز ہیں:

> ''اکبر کے نزدیک شاعری کا مقصد زندگی کی تنقید و اصلاح تھا''

(بحوالہ: تعارف، انتخاب اکبر الہ آبادی، ص: ۷)

اکبرؔ نے جس عہد میں اپنی شاعری کا آغاز کیا، وہ انگریزی حکومت کے زیر اثر ذہنی غلامی اور احساس کمتری کا پروردہ تھا۔ مغربیت ہندوستانی تہذیب پر حاوی ہو رہی تھی۔ ہندوستانی قدریں اوراق پارینہ سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھی جا رہی تھیں۔ ایمان اور عقائد میں تزلزل آچکا تھا۔ ہندوستانی طرز معاشرت پر مغربی مادیت پرستی نے حرص وطمع، مکرونفاق، خودغرضی، غداری، نفس پروری اور عیش پرستی جیسی اخلاقی خرابیوں کا دروازہ کھول دیا تھا۔ ملک کی یکجہتی اور قوم کی باہمی ہمدردی کا تصور مادی رسہ کشی کی نذر ہو گیا تھا۔ قوم کا زوال ہو رہا تھا، وہ شکستہ حال اور پست ہوتی چلی جا رہی تھی۔ سید احتشام حسین اپنی تصنیف ''تنقید اور عملی تنقید'' میں لکھتے ہیں۔

> ''غدر کے بعد ہندوستان ایک نیم جاگیردار نیم صنعتی دور میں داخل ہو چکا تھا متوسط طبقے کے اندر فرقہ پرستی کا زہر پھیل چکا تھا مسلمان اپنے ماضی کو سینے سے چمٹائے ہوئے وقت کے ساتھ چلنے سے انکار کر رہے تھے اور نئے سرمایہ دارانہ نظام کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے کچھ لوگ ایسے تھے جو انگریزی حکومت کی سیاسی اور معاشی نوعیت کو نظرانداز کر کے اسے محض ایک عیسائی حکومت سمجھتے تھے''

(بحوالہ: مشمولہ مضمون: اکبر کا ذہن، تنقید اور عملی تنقید، ص: ۱۱۲)

ایسے پرآشوب زمانے میں اکبرؔ نے طنز ومزاح کے پیرائے میں اپنی شاعری کے ذریعہ ہندوستانی عوام کو برطانوی حکومت کی سازشوں سے آگاہ کیا۔ انہوں نے اپنے کلام کے ذریعہ عوام کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی کہ لوگ مغربی تہذیب وتمدن، نئی تکنیک، سائنس اور جدید تعلیم نظام سے فائدہ اٹھائیں، لیکن اپنی قدیم تہذیب وتمدن کا پاس بھی رکھیں، اس کو پوری طرح فراموش نہ کر دیں، اور نہ ہی اس کو مغربی تہذیب کی چمک دمک کے روبرو کمتر جانیں۔ انہوں نے ہندوستانیوں کے ضمیر کو بیدار کرنے کی پرزور کوشش کی۔ اور اپنی معرفت حاصل کرنے کی تلقین کی۔ جس کی زندہ وجاوید مثال ان کا شعری کلام ہے۔

قومی اصلاح وبیداری کے باب میں اکبرؔ نے بہت سے ایسے سیاسی، سماجی، اخلاقی اور تہذیبی مسائل کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا جو انسانیت بالخصوص ہندوستانی قوم کے لئے مُہلک تھے۔ کیونکہ وہ نووارد تہذیب وتمدن کے تئیں بے حد محتاط اور مشکوک طبیعت کے حامل تھے۔ میرے خیال میں اکبرؔ کا یہ محتاط رویّہ عالمی تاریخ وتمدن سے واقفیت کے نتیجہ میں تھا۔ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ کس طرح قوموں کا زوال ہوتا ہے اور ان میں اخلاقی بحران آتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ اکبرؔ نے ہر مشکوک شئے اور خیال میں قوم کی رہنمائی کی

> ''اکبرؔ نے قومی اصلاح وبیداری میں جن مختلف مسائل کو تنقید کا نشانہ بنایا ان میں انگریزی طرز تعلیم ایک اہم مسئلہ تھا۔ وہ اپنے عہد کے انگریزی نظام تعلیم میں اخلاقی کمزوری پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اس نظام تعلیم پر طنز کرتے ہیں اگر۔ اس عہد کے نظامِ تعلیم کا جائزہ لیا جائے، تو فارسی نظامِ تعلیم کی اتباع میں مذہبی کتابوں کے علاوہ اخلاقیات پر مبنی 'گلستاں اور بوستاں' جیسی کتابوں کو اہمیت دی جاتی تھی، اس کے بعد دیگر دنیوی علوم سکھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ان اخلاقی کتابوں کا یہ اثر تھا کہ فرد سماج کے مطابق خود کو تیار کرتا تھا جبکہ انگریزی نظام تعلیم میں محض مادیت پر زور دیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے عوام میں اخلاقی اقدار کی کمی آئی اور لوگ سماجی روابط کو نظرانداز کرنے لگے جو اکبرؔ کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھے۔''

اوران کو بیدار کرنے کی کوشش کی، تاکہ عوام ذہنی غلام بننے سے محفوظ رہیں۔اس عہد کے دیگر اہم مصلحین کی طرح اکبرؔ نے بھی ایک لائحہ عمل تیار کیا اور قوم کی ایسے حالات میں رہنمائی کی جبکہ ہر طرف شک وشبہ اور دورنگی کی تاریکی تھی،لہٰذا اکبرؔ اپنے معاصر سرسید اوران کے رفقاء سے پیچھے نہیں رہے بلکہ اپنے خودساختہ نقطۂ نظر کی روشنی میں قومی اصلاح وبیداری کے لئے کوشاں رہے۔بقول صدیق الرحمٰن قدوائی:

"سرسید تحریک کے علمبرداروں نے اوراکبرؔ نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق شاعری کے ذریعے قومی اصلاح کی کوشش کی سماجی اعتبار سے متضاد نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود سرسید، حالیؔ اوراکبرؔ یکساں ادبی نقطۂ نظر کے حامل ہیں"

(بحوالہ: تعارف، انتخاب اکبر آبادی، ص:7)

اردو ادب کے اکثر ناقدین اکبرؔ سے متعلق یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ وہ ہر نئی چیز اور تبدیلی کے خلاف تھے، انہیں ہر پرانی چیز عزیز تھی اور نئی چیز سے چڑھ تھی۔رام بابو سکسینہ کہتے ہیں کہ:

"وہ وقت کے ساتھ چلنا نہیں چاہتے اور مغربی تعلیم کے مستقل اور دیرپا فوائد کے قائل نہ تھے"

(بحوالہ: تاریخ ادب اردو،ص:)

اسی طرح احتشام حسین رقمطراز ہیں کہ:

"انہوں نے مغربی علوم اور سائنس کی مخالفت کرکے ہندوستان پر معاشی ترقی اور نئے سیاسی شعور کے دروازے بند کرنے کی کوشش کی"

(بحوالہ: مشمولہ مضمون'اکبر کا ذہن'، علی گڑھ میگزین، ص:۱۳۸)

ناقدین نے اکبرؔ کو اسی طرح کی متعدد آراسے نوازا ہے۔لیکن بحیثیت طالبعلم میرا خیال ہے کہ اکبرؔ نے اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے ذریعہ قوم کی ترقی میں رکاوٹ پیدا نہیں کی بلکہ اپنے عہد کے لوگوں کو برطانوی حکومت کی استحصالی پالیسوں سے باخبر کیا۔انگریز یہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی عوام سیاسی طور پر غلام بنی ہی رہے ساتھ ہی ساتھ تہذیبی طور پر بھی ان کو غلامی کی زنجیریں پہنادی جائیں۔انگریزوں کی یہ کوشش تھی کہ ہندوستانی اپنی اصل شاخت سے محروم ہوجائیں اور وہ پوری طرح انگریزوں کے زیرسایہ آجائیں۔ان کے دلوں سے ہندوستانی تعلیم وتہذیب کی اہمیت وافادیت کے عقیدے کو مسخ کردیا جائے، تاکہ وہ ہر طرح سے مغرب کے قدردان اور محتاج ہوجائیں۔جیسا کہ گورنر جنرل لارڈ کرزن کے ان الفاظ سے یہ بات اور واضح ہوجاتی ہے"ہندوستان میں ایسا طبقہ پیدا ہوجائے جو رنگ اور خون میں ہندوستانی ہولیکن مذاق، اخلاق اور ذہن میں انگریز ہو"(بحوالہ: اکبر الہ آبادی،صغرا مہدی، اشاعت ۱۹۰۵ء،ص:30) یہی وجہ ہے کہ اکبرؔ نے قوم کے مفاد میں پوری ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے عوام کے شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی تاکہ ہندوستانی انگریزی کلچر کی اتباع میں اندھی تقلید سے باز آئیں۔اکبرؔ کا یہی ذہن ہے جو کبھی کبھی جھنجلاہٹ کا احساس بھی دلاتا ہے اور یہ جھنجلاہٹ طنز کی جگہ لے لیتی ہے مثلاً دوشعر ملاحظہ ہوں:

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ پوچھتا ہوں تم سے ہندی
یورپ کا تیری رگوں میں خون بھی ہے

میرے خیال میں اکبرؔ کی اسی طنزآمیز جھنجلاہٹ کو ناقدین نے ان کی قدامت پسندی اور سماجی ارتقائی دشمنی سے تعبیر کیا ہے۔اس ضمن میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے نہایت ہی مناسب رائے پیش کی ہے:

"اردو کے نقادوں نے کم وبیش یک زبان ہوکر ان کی نکتہ چینی کی ہے کیونکہ اکبرؔ انہیں ترقی، سائنس، اور روشن خیال طرز فکرو حیات کے دشمن نظر آتے ہیں"

(بحوالہ:۴۰واں ذاکر حسین یادگاری خطبہ اکبر الہ آبادی: نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار،ص:۴۰)

اختلافات سے قطع نظر اکبرؔ کے ذہن کو سمجھنے کے لئے محض یہی جاننا کافی ہے کہ وہ مغربی تعلیم اور انگریزی تہذیب وتمدن کے سرے سے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ خود انگریزی ملازم تھے اور اپنے بیٹے عشرت حسین کو سول سروسز کی تیاری کے لئے انگلستان بھی بھیجا تھا۔

اکبرؔ نے قومی اصلاح وبیداری میں جن مختلف مسائل کو تنقید کا نشانہ بنایا ان میں انگریزی طرز تعلیم ایک اہم مسئلہ تھا۔وہ اپنے عہد کے انگریزی نظام تعلیم میں اخلاقی کمزوری پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اس نظام تعلیم پر طنز کرتے ہیں اگر۔اس عہد کے نظام تعلیم کا جائزہ لیا جائے، تو فارسی نظام تعلیم کی اتباع میں مذہبی کتابوں کے علاوہ اخلاقیات پر مبنی 'گلستاں اور بوستاں' جیسی کتابوں کو اہمیت دی جاتی تھی، اس کے بعد دیگر دنیوی علوم سکھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ان اخلاقی کتابوں کا یہ اثر تھا کہ فرد سماج کے مطابق خود کو تیار کرتا تھا جبکہ انگریزی نظام تعلیم میں محض مادیت پر زور دیا جاتا تھا۔اسی وجہ سے عوام میں اخلاقی اقدار کی کمی آئی اور لوگ سماجی روابط کو نظرانداز کرنے لگے جو اکبرؔ کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھے۔اس اجتماعی شعور کو اکبرؔ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں
نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرتِ آدم سے کیا مطلب
نئی تعلیم میں تقوے کا وہ اکرام کہاں
ناز بے حد ہے مگر غیرتِ اسلام کہاں

اکبرؔ اگر ایک طرف انگریزی نظام تعلیم کے مضر اثرات پر توجہ دلاتے ہیں تو دوسری طرف وہ مشرقی تہذیب بالخصوص ہندوستانیت پر زور دیتے ہیں۔ان کی نظر میں ہندوستان میں عورتوں کی پردہ داری اور حیا ہندوستانی تہذیب کا اہم حصہ ہے۔جس پر محض مسلمان طبقے کی ہی اجارہ داری نہیں بلکہ یہ مشرقی اور ہندوستانی تہذیب کا شعار ہے کہ مسلمانوں میں اس کو نقاب سے تعبیر کرتے ہیں تو ہندو قوم میں گھونگھٹ کہلاتا ہے۔جبکہ مغربی تہذیب میں آزادئ نسواں کے نام پر عورتوں کو بے حیائی اور بے پردگی پر زور دیا جاتا تھا۔جو مشرقی مزاج کے بالکل مخالف تھا۔جس پر اکبرؔ نے زبردست تنقیدیں کی ہیں:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبرؔ زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اکبرؔ کے عہد میں نئی تہذیب وتعلیم کی چمک دمک نے مردوں سے زیادہ عورتوں کو لبھایا۔آزادئ نسواں اور تعلیم نسواں جیسے کھوکھلی نعرہ بازی نے باعزت خواتین کو بھی سربازار ایک لیڈی کی شباہت میں لاکھڑا کیا۔اب نئی تعلیم یافتہ خاتون شوہر پرست بیوی کے بجائے پبلک پسند لیڈی کہلانے میں زیادہ فخر محسوس کرنے لگی تھی۔اکبرؔ تعلیم نسواں کے خلاف نہیں تھے بلکہ اعتدال کے قائل تھے۔ان کا خیال تھا کہ عورتوں کو ایسی تعلیم سے مزین کیا جائے جو انکی اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی ترقی میں معاون ہو اور وہ دنیا وآخرت کی فلاح وبہبودی حاصل کرسکیں۔لیکن انہوں نے دیکھا کہ انگریزی تعلیم کے اثر سے" حامدہ شمع انجمن"بن کر چمک رہی ہے، امورخانہ داری

کو خیرباد کہہ کر بے پردہ پلیٹ فارم پر آزادی کے نعرے لگا رہی ہے اور اپنے مذہب و اخلاق کے ناموس مٹی میں ملا رہی ہیں۔ اکبرؔ عورتوں میں یہ تہذیب کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ وہ اس بدلتی ہوئی نسوانی دنیا پر کاری ضرب لگاتے ہیں، اس ضمن میں اشعار ملاحظہ ہوں:

قومی ترقیوں کی زمانے میں دھوم ہے
مردانے سے زیادہ زنانے میں دھوم ہے
تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہو
جاتی ہے اسکول میں لڑکی کہ کچھ حاصل کرے
کیا ہوا حاصل جو بس بے باک ہو کر رہ گئی

ماحول کے برے اثرات اور تعلم کی خرابی سے پیدا شدہ غیر واجبی احساس آزادی اور نمائش پسندی پر اکبرؔ نے خوب کہا ہے:

تعلیم کی خرابی سے ہوگئی بالآخر
شوہر پسند بی بی پبلک پسند لیڈی
حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی
ان سے بیوی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

اکبرؔ مغربی تعلیم کے خلاف نہیں تھے اگر ان کو شکایت تھی تو اپنے زمانے سے خصوصاً ان افراد سے جن کی آنکھیں مغربی تعلیم، نئی روشنی اور مصنوعی بجلیوں سے خیرہ ہو چکی تھیں۔ جنہوں نے اپنے دین و ایمان، مذہب وملت اور قدیم حسن اخلاق سے دستبردار ہو کر زندگی کے ہر شعبے میں لفظاً و معناً مغرب کی پیروی شروع کر دی تھی ان کے نام اکبرؔ نے یہ اصلاحی پیغام پہنچایا:

حاصل کرو علم، طبع کو تیز کرو
باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبرؔ
اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

اکبرؔ کے کلام میں بہت سے اشعار ہندوستانی سیاست کے مسائل پر مبنی ہیں۔ وہ اپنے خاص مزاحیہ لہجے میں بہت سے تلخ سیاسی مسئلوں کو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے داخل میں اکبرؔ کا اصلاحی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ ان کا کلام ملک کے عام سیاسی احوال وکوائف کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ سیاسی لیڈران اور ملک کے کے تئیں پالیسیوں کو شاعرانہ تنقید کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی خامیوں پر انگلی رکھتے ہوئے کمیوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ملازمت پینشن اور انگریزی حکومت کی جانب سے عطا کردہ خطاب خان بہادر کے باوجود جس جرات اور دلیری سے اکبرؔ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا وہ ان ہی کا امتیاز ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجئے:

ہندو مسلم ایک ہیں دونوں
یعنی دونوں ایشیائی ہیں
ہم وطن ہم زبان و ہم قسمت
کیوں نہ کہہ دوں کہ بھائی بھائی ہیں

اکبرؔ کے نزدیک ہندوستان کی سیاسی مشکلات کا حل حصولِ قوت، پابندی مذہب، حق پرستی اور مختلف اقوام کا باہمی اتفاق تھا۔ ذیل کے اشعار گویا ان کے سیاسی خیالات کا نچوڑ ہیں:

قصیدے سے یہ چلتا ہے نہ یہ دوہے سے چلتا ہے
سمجھ لو خوب کار سلطنت لوہے سے چلتا ہے

انگریزوں نے ہندوستانی عوام پر طویل عرصے تک حکومت کرنے کے لئے جو پالیسیاں اختیار کیں ان میں سب سے خطرناک پالیسی قومی اتحاد کو توڑنے کا سیاسی عمل تھا۔ جس کے لئے انہوں نے فرقہ پرستی اور ذات پات کو مدعا بنایا، اور ہندو مسلمان کو ایک دوسرے کے مخالف کھڑا کر دیا، جو قومیں صدیوں سے ہندوستانی طرز معاشرت کے زیر سایہ متحد ہو کر زندگی بسر کرتی تھیں اب وہ مذہب، ذات اور زبان کی بنیاد پر تعصب اور کشیدگی کا شکار ہونے لگی تھیں۔

المختصر یہ کہ اکبر الہ آبادی نے قومی اصلاح و بیداری میں اپنے دور کے جن مسائل کو مطمح نظر بنایا وہ اخلاقی، تعلیمی، سیاسی، حریت نسواں اور طرز معاشرت جیسے موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے ملک، سماج اور ہندوستانی طرز معاشرت کے مفاد میں اپنی شاعری کے ذریعے زبردست احتجاج کیا ہے۔ اور ملک وقوم کی اصلاح و بیداری میں بڑی سرگرمی دکھائی ہے۔ چونکہ اکبرؔ اصلاحی نقطۂ نظر کے قائل تھے، اس لئے حتی المقدور ہر ایسے منفی رجحان کی مخالفت کی جس میں ملک وقوم کی تہذیبی اور اخلاقی فساد کا اندیشہ تھا۔ انہوں نے اپنی طنزیہ شاعری میں مسخ ہوتی ہوئی ملکی وقومی قدروں کی اہمیت و افادیت کی بات کی، اور نئے انگریزی نظام کے زیر اثر رواج پانے والے مغربی طرز معاشرت، اخلاقی فساد، احساس کمتری، نفاق، نفس پرستی، اور مادیت جیسی لاعلاج نفسیاتی امراض سے قوم کو آگاہ کیا، اور طنز و مزاح کے پہلو میں بے لاگ تنقیدیں کی ہیں۔ اگر چہ اکبرؔ کے کلام میں مزاحیہ اور طنزیہ لہجہ نمایاں ہے لیکن اس کی گہرائی میں ایسا درد پوشیدہ ہے جس نے ان کو قوم کی اصلاح میں سرگرم رکھا، ان معنوں میں اکبرؔ کی ایک الگ شناخت ہے جنہوں نے ملک وقوم کو ان کے شعار پر توجہ دلائی۔ اس زاویہ نگاہ سے اکبرؔ کی شاعری اور ان کی فکر دونوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جس کا بہترین عملی نمونہ موجودہ مغرب کی سسکتی ہوئی تہذیبی قدریں ہیں۔ جن کے حاملین حیران و پریشان ہیں۔ یہ صورتحال اکبرؔ کی شاعرانہ نگاہ سے مخفی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اکبرؔ کی شاعرانہ شخصیت آج بھی زندہ ہے۔ میں اس مقالے کا اختتام اکبرؔ کے ان اشعار پر کرتا ہوں:

وہ بات جن سے قومیں ہو رہی ہیں نام ور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطرافِ دنیا میں سفر سیکھو
خواصِ خشک و تَر سیکھو، علومِ بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانو! ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

کتابیات

۱۔ روح اکبر، مرتب؛ عبدالجلیل، سنٹرل پبلشنگ ہاؤس بنگلور ۱۹۵۰۔
۲۔ اکبر الہ آبادی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۳۔
۳۔ اکبر الہ آبادی، طالب الہ آبادی، انوار احمدی الہ آباد، ۱۹۳۱۔
۴۔ 'اکبر کا ذہن' مشمولہ مضمون ''تنقید اور عملی تنقید'' احتشام حسین، اتر پردیش اردو اکادمی، ۲۰۰۵۔
۵۔ اکبر الہ آبادی، صغرا مہدی، نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی، ۲۰۰۹۔
۶۔ 'تعارف'، انتخاب کلام اکبر، تصحیح وترتیب؛ صدیق الرحمن قدوائی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ۱۹۷۳۔
۷۔ ۱۴واں ذاکر حسین یادگاری خطبہ ''اکبر الہ آبادی نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار''، شمس الرحمن فاروقی، ذاکر حسین کالج نئی دہلی، ۲۰۰۲۔
۸۔ اکبر الہ آبادی ایک سماجی اور سیاسی مطالعہ، ڈاکٹر افصح ظفر، عرشیہ پبلیکیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۱۔
۹۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں، عبدالماجد دریابادی، ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۵۴۔

❑❑❑

غزل

بساطِ زندگی خونریز لمحوں کا تماشا ہے
خدا خاموش، انساں دم بخود، حیرت میں دنیا ہے

ہمیں اس قوم کے بیٹے ہیں جس کی جاں نثاری نے
شعورِ سرفروشی کو نیا انداز بخشا ہے

شکستِ آدمیت سے عجب حالت ہے انساں کی
سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ روتا ہے کہ ہنستا ہے

تمام آئینہ خانے اضطرابِ شوق سے زخمی
ذرا دیکھو کوئی چہرہ چمکتا ہے دمکتا ہے؟

سب اپنی اپنی تنہائی کے جنگل میں بھٹکتے ہیں
بھرا ہے شہر لوگوں سے مگر ویران لگتا ہے

کشاکش کا وہ عالم ہے کہ بجھ کے رہ گیا ہے دل
نہ اب جینے کی خواہش ہے نہ مرنے کی تمنا ہے

غریبی، تنگدستی، ذلت و رسوائی، تنہائی
انس مسرورؔ دیکھو اپنے دامن میں بھی کیا کیا ہے

انس مسرور انصاری
اردو بازار، سکراول، ٹانڈہ امبیڈکر نگر
7860220311

غزل

وہ کھرے ہی سہی اتنے جو نہ کھارے ہوتے
دوست تو دوست ہے دشمن کو بھی پیارے ہوتے

ہم کو مستغنی بھی اللہ غنی نے رکھا
ورنہ در در پہ کھڑے ہاتھ پسارے ہوتے

آپ بے فکر رہیں، آپ پریشان نہ ہوں
آپ پر آنچ نہ آئے گی ہمارے ہوتے

ہم ترا نام ہی میزان میں رکھ دیتے ہیں
گوشوارے میں بھلا کیسے خسارے ہوتے

جرعۂ زم زم ''شہداب'' ہے اپنی ہستی
گم سمندر میں جو ہو جاتے تو کھارے ہوتے

بات کہنا بھی ہنر بات نہ کہنا بھی ہنر
خامشی سے بھی ہیں کیا کیا نہ اشارے ہوتے

ہم کو لے ڈوبا ہمارا یہی سورج ہونا
ورنہ ہم خیرؔ کئی آنکھوں کے تارے ہوتے

ڈاکٹر رؤف خیر
موتی محل، گولکنڈہ
9440945645

غزل

سفر کی بات پہ کب قال و قیل چلتے ہیں
جو دعوے دار ہیں راہِ دلیل چلتے ہیں

رکاوٹوں کے لئے اہتمام سے ہر پل
ہمارے ساتھ یہاں سنگِ میل چلتے ہیں

ہمارا دامن غم تار تار کرنے کو
ہزار طرح کی چالیں ذلیل چلتے ہیں

جو دل میں فتح کی آندھی کو دھڑکنیں کر لیں
انھیں کے ساتھ منار و فصیل چلتے ہیں

ہم اپنے وقت کے فرعون کو لئے ہمراہ
اسی بہانے سے دریائے نیل چلتے ہیں

بلندیوں سے وہ تحت الثری کی جانب ہیں
رہِ نفاق اگرچہ بخیل چلتے ہیں

انھیں کو دیکھ کے کرتے ہیں خودکشی ہم لوگ
جو لے کے آنکھوں میں مصداقؔ جھیل چلتے ہیں

مصداق اعظمی

جوماں پوسٹ۔مجواں، پھولپور، اعظم گڑھ

9451431700

غزل

ہوگئی ہے اسی غم میں مری بھاری آواز
اب سنائی نہیں دیتی ہے تمہاری آواز

میری آواز مرے جسم میں یوں گونجتی ہے
جیسے صحرا میں کوئی درد کی ماری آواز

آج وہ تلخ زبانی پہ اتر آیا ہے
جس کی آواز ہوا کرتی تھی پیاری آواز

شور اٹھتا ہے تو کہرام کی صورت پل میں
میرے سینے پہ چلا دیتی ہے آری آواز

زخم اس دل پہ ہوا کرتا ہے اس کا گہرا
ضرب جب کوئی لگا دیتی ہے کاری آواز

میں جو بولا تو پھر اس نے کہا خاموش رہو
بس اسی واسطے آواز سے ہاری آواز

ڈھلتی ہے کیفیتِ دل کے مطابق رہبرؔ
خود میں رکھتی ہے بہت آئینہ داری آواز

معید رہبرؔ

سعادت گنج لکھنؤ

9889371674

انیس النبی

شاہ امن ہاؤس، شاہ امن لین، کدر پور، کولکاتہ

7003227203

سارانش

طارق میرا چھوٹا بھائی ہے- رامش دبے لہجے میں کہہ رہا تھا اس شہر میں تقدیر آزمانے آیا ہے- کالجوں کے چکر کاٹ رہا ہے- آج نہیں تو کل لیکچرر شپ حاصل کر ہی لے گا-

یہی تو میں نہیں چاہتی!

کیوں؟ اس میں تمہارا کیا نقصان ہے؟ خود دار ہے- ملازمت پاتے ہی شفٹ ہوجائے گا کہیں- طارق کو اپنی بھابی کی متضاد شخصیت سے گھبراہٹ ہوئی- ڈرائنگ روم کی بتی بجھا کر طارق صوفے پر لیٹ جاتا ہے- بھابی کی آواز سنائی دیتی ہے- میں کبھی نہیں چاہتی کہ وہ اسٹیبلش ہو، کیونکہ وہ اسٹیبلش ہوگا تو شہلا کامیاب ہوجائے گی- میں چاہتی ہوں وہ ہمیشہ جلتا رہے-

نئی طرح کی ایسی منفی باتیں سن کر طارق بے چین ہوجاتا ہے-شہلا اور یاسمین کی دوستی کے وہ سارے والہانہ پن اسے یاد آنے لگے جب شہلا کے گھر اسکی بھابی کے خوشگوار دن گزرتے تھے-شہلا کے والد محلہ کے دولتمند آدمی تھے- اور یاسمین کے والد ریٹائرڈ ڈرافٹ مین- یاسمین کی نت نئی ضرورتیں شہلا کی قربت میں پوری ہوتیں-

> ”یاسمین کا طنزیہ چہرہ اک سوال بنا ہوا تھا-مکھوٹے کا کاروبار تو فرش سے عرش تک پھیلا ہوا ہے- نت نئے خداؤں کے مکھوٹے ... انگنت شیطانوں کے مکھوٹے اور انسانوں کے مکھوٹوں کے بارے میں نہ پوچھیں تو بہتر ہے-لیکن میرے مکھوٹے سب سے جدا ہوتے ہیں-ضرورت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں کبھی مریم بن جاتی ہوں: کبھی ہندہ! رامش اپنی پری پیکر بیوی کو ایسے دیکھنے لگا جیسے کوئی سفاک قاتل کو دیکھتا ہو- یاسمین کی اجنبی آنکھوں اور زہریلی مسکراہٹ سے رامش کا دل بیٹھنے لگا- طارق اپنے سادہ لوح بھائی کی جذباتی بربادی پر اداس ہوگیا- یاسمین نے شوہر سے کہا آپ کو یاد ہے جب آپ علاقائی سطح پر ایک مشہور فنکار تھے ہر دن میرے گھر آجاتے تھے میری ایک جھلک دیکھ کر مجھ سے باتیں کرکے سرشار ہوجاتے تھے-لیکن میں ذہنی خلکان میں مبتلا ہوجاتی تھی...“

رامش چادر اوڑھے ایسے لیٹا ہوا تھا کہ ان میں سے کوئی اگر ڈرائنگ روم میں آجائے تو اسے گہری نیند میں دیکھ کر مطمئن ہوجائے- طارق اپنے بھائی اور بھابی کی تکرار سننا چاہ رہا تھا- بھابی کہہ رہی تھی طارق سے مجھے کوئی شکایت نہیں اس کی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ شہلا کا شوہر ہے- اگر وہ شہلا کا معیار نہ بڑھاتا تو ہماری جانب سے خوشحالی کے سارے دروازے اسے کھلے ملتے- اس نے شادی کر کے شہلا کو میرے برابر کھڑی کر دیا ہے- مجھے وہ ساری ذلتیں یاد ہیں جب میں اسکی شاندار زندگی دیکھ دیکھ کر کڑھا کرتی تھی حسد کی آتشی موجیں میرے وجود کو جھلساتی تھیں- اور میں اوپر او پر مسکرا کر غربت کی اذیت کو چھپاتی رہتی- آج میں آپ کے ذریعہ دولتمند بن چکی ہوں- میں نے آپ سے شادی کر کے صحیح فیصلہ کیا- شہلا نے طارق سے شادی کرکے غلط فیصلہ کیا- اس کا باپ سرمایہ دار تھا میرا باپ غریب تھا- میں جلتی رہی- اب اس کا شوہر غریب ہے وہ جلے گی- اب میں ہراس زمین کو کھینچ لونگی جس کے نیچے آپ کے پیارے بھائی کے قدم ہونگے-

یہ تم اچھا نہیں کر رہی ہو رامش کے احتجاجی لہجے میں پسپائی تھی- اللہ سے ڈرو...ذرے ذرے کا حساب لیتا ہے... اسی دنیا میں لیتا ہے- بکواس...سب بکواس ہے! یاسمین کا غرور بولنے لگا ساری باتیں غریبوں کی لوریاں ہیں- ناکام...نامراد ذہنی بھکاریوں کے واویلے ہیں- اللہ کے اور بہت سارے کام ہوتے ہیں... ذروں میں الجھنے والا اللہ مجھے پسند نہیں! صبر کے دلدل اور شکر کے سراب میں زندگی کا ستیاناس کرنے والے اللہ نے خواہ مخواہ کے دو بڑے بھائی اور نرگسیت کے شکار باپ کی بوجھل سر پرستی میں میرے حسن وشباب کو گرہن لگا دیا تھا- طارق پہلی بار بھابی کو اپنی فیملی کے خلاف بولتے ہوئے سن رہا تھا-

رامش نے بیوی سے کہا یہ کیا کہہ رہی ہو!؟ تم نے تو اپنے والد کو ہمیشہ آئیڈیل میں ہی سمجھا اور بھائیوں کے قصیدے ہی پڑھے-

جھوٹ...!؟ سب جھوٹ... جھوٹ کہا تھا میں نے- اپنے آپ سے بھی جھوٹ کہا تھا- ایسا جھوٹ جو مجھے بھی سچ لگنے لگا تھا- میرا باپ کوئی آئیڈیل مین وین نہیں تھا- بکواس کرتا رہتا تھا- میری سیدھی سادی ماں اور ان کے خاندان کو کمتر اور اپنے خاندان کو برتر سمجھتا تھا اگر وہ اتنا ہی اعلی تھا تو ساری زندگی گھر جمائی بنا کیوں رہا؟ اس نے اپنے امیج کو بچوں کے سامنے ایسا تراشا تھا کہ ہم سب اس کی اولاد ہونے پر فخر کرتے تھے اور اس کا نشہ سب سے زیادہ مجھ پر چڑھا تھا جو اتر چکا ہے- وہ ایک ڈرافٹ مین تھا...صرف ڈرافٹ مین تو رابندرناتھ ٹیگور کے ہاتھوں کس کارنامے پر اسے انعام ملا؟ اور وہ انعام کبھی نظر کیوں نہیں آیا؟

ایک معمولی سی شیلڈ یا مومنٹو بھی آدمی ساری زندگی سجائے رکھتا ہے۔ نوبل انعام یافتہ شخصیت کے ہاتھوں ملنے والا انعام آخر گیا کہاں؟

رامش اپنی بیوی کا بپھرا روپ دیکھ کر خاموش تھا۔ یاسمین مسلسل بولے جا رہی تھی۔ اس خبیث نے ساری زندگی میری ماں کو کمتر اس لئے سمجھا کہ میرے نانا جہاز میں بٹلر کی حیثیت سے ملازم تھے۔۔۔تو پھر بٹلر کے گھر پہ زندگی کیوں گذار دی؟ کہاں گئی تھی خودداری؟

اور آپ سے جب میری شادی ہوئی دولت اور شہرت میں ہمارے خاندان کا قد اونچا ہوا تو ڈھاکہ سے پھوپھیاں پہلی بار ملنے آئیں مغرب زدہ پرکشش کھوسٹ بڑھائیں تھیں دونوں۔ انگلش زدہ بنگلہ جملوں کے پھول برسا رہی تھیں۔

لیکن ان باتوں سے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟

اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہتی ہوں جسے اب تک آپ جانتے نہیں۔ میں اپنی آزادی دولت اور سرداری کے سرور پہ اب آنچ آنے نہیں دونگی۔ بھائیوں کے آگے مجبور تھی چھوٹی چھوٹی خواہشیں کچل کر اپنی محتاجی اور انکی مختاری کی اذیت جھیل چکی ہوں۔ لمبی کہانی ہے بھولنا چاہتی ہوں مگر بھول نہیں پاتی۔ ان واردات نے کئی مکھڑے دیئے مجھے۔

تو میں ابھی تمہارے قریب ہوں کہ مکھڑے کے سامنے؟ رامش کے چہرے پر سوالوں کے تھپیڑے تھے۔ اس نے تو ایک معصوم اور حسین سی لڑکی کا ہاتھ تھاما تھا پھر یہ کون ہے؟

کیوں؟ مکھوٹے آپ کو پسند نہیں؟ یاسمین کا طنزیہ چہرہ اک سوال بنا ہوا تھا۔ مکھوٹے کا کاروبار تو فرش سے عرش تک پھیلا ہوا ہے۔ نت نئے خداؤں کے مکھوٹے۔۔۔۔ انگنت شیطانوں کے مکھوٹے اور انسانوں کے مکھوٹوں کے بارے میں نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔ لیکن میرے مکھوٹے سب سے جدا ہوتے ہیں۔ ضرورت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں کبھی مریم بن جاتی ہوں: کبھی ہندہ!

رامش اپنی پری پیکر بیوی کو ایسے دیکھنے لگا جیسے کوئی سفاک قاتل کو دیکھتا ہو۔ یاسمین کی اجنبی آنکھوں اور زہریلی مسکراہٹ سے رامش کا دل بیٹھنے لگا۔ طارق اپنے سادہ لوح بھائی کی جذباتی بربادی پر اداس ہو گیا۔ یاسمین نے شوہر سے کہا آپ کو یاد ہے جب آپ علاقائی سطح پر ایک مشہور فنکار تھے ہر دن میرے گھر آجاتے تھے میری ایک جھلک دیکھ کر مجھ سے باتیں کرکے سرشار ہو جاتے تھے۔ لیکن میں ذہنی خلفشار میں مبتلا ہو جاتی تھی۔۔۔ کچھ کہہ نہ پاتی تھی کیونکہ میں اس وقت اپنے معصوم اور اخلاقی مکھوٹے اتارنے کی پوزیشن میں نہیں تھی آپ اپنی محدود آمدنی کے باوجود تحفوں کی بوچھار کرتے تھے۔۔۔ جن کی مجھے بہت ضرورت تھی کیونکہ یہ چیزیں باپ اور بھائیوں سے حاصل کرنا اک خواب سے کم نہ تھا۔

یعنی وہ جو تمہارا محبت آمیز رویہ تھا۔۔۔ وہ کیا تھا!؟

مکھوٹے کی جلوہ گری!

یاسمین کا تیزابی چہرہ رامش کی روح کو جلانے لگا۔

ڈھیر سارے لوگوں سے مجھے نفرت تھی ان سب کو اپنے پاؤں تلے روندنا چاہتی تھی۔ اور اپنے خاندان کے بے وجود لوگوں کا قد بڑھا کر آپ سب کو اذیت دینا چاہتی تھی۔ رامش اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ سنا آپ نے!؟ اسی لئے میں نے اپنے پرانے عاشق سے منگنی توڑ کر آپ سے شادی کر لی۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ آپ کالے ہیں۔۔۔ موٹے ہیں۔۔۔ پستہ قد ہیں۔۔۔ اور گنجے بھی ہیں۔ میں نے محبت کی اداکاری کی اور آپ پسر گئے۔

بیوی کی باتیں سن کر رامش خاموش ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کہے کیا سوچے کون سا قدم اٹھائے۔ یاسمین کی محبت میں برسوں ڈوبے رہنے کی وجہ سے اس کی اقدامی قوت لاشعور میں کہیں دب سی گئی تھی۔ وہ شادی سے پہلے خودداری اور خود اعتمادی کا پیکر تھا لیکن یاسمین کی جنسی حسن آرائی اور مصنوعی دلربائی کے بھنور میں پھنس کر خود کو بھول گیا تھا اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر چکا تھا۔ وہ خود کو ایک خوش نصیب انسان سمجھتا تھا کہ اس کی زندگی میں حسن وسیرت سے آراستہ ایک شریک حیات ہے جس کی قربت میں زندگی بامعنی ہے۔

گہرا سکوت بیڈ روم کی فضا میں چھایا ہوا تھا۔ رامش بیٹھا ہوا تھا۔۔ بے وجہ بوجھل احساس کے ساتھ آراستہ بیڈ روم کے بیاباں سے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ اس کی بیوی بستر پہ چلی گئی تھی۔ وہ پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

خوشگوار یادوں کا جھونکا شادی کے ابتدائی دنوں میں اسے لے گیا۔ یاسمین کے رومانی مزاج خلوص اور زندہ دلی کی وجہ سے رامش کو محسوس ہوتا کہ وہ زمینی جنت میں کسی حور کی قربت میں ہے۔ سوئٹزرلینڈ کی حسین شام ہے۔ رامش کے ہاتھ میں ہیروں سے مزین ہار ہے۔ یاسمین کے خوبصورت گلے میں وہ ہار ڈالتے ہوئے رامش سرشاری میں کہہ رہا ہے یہ ہمارا یادگار ہنی مون ہے۔ اس وقت میں خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھ رہا ہوں۔

خوش نصیب تو میں ہوں۔ یاسمین نے ادا سے کہا' آپ جیسی ہستی نے مجھے اپنی زندگی میں شامل کیا۔ لیکن جمالیاتی سطح پر کہاں تم اور کہاں میں! قد وقامت اور رنگ روپ میں تمہارے سامنے کچھ بھی نہیں۔

رامش کے ہونٹوں پہ انگلیاں رکھ کر یاسمین کہتی ہے آپ کا سراپا مجموعی اعتبار سے مردانہ وجاہت کی مثال ہے۔ کامیابی کی جس بلندی پر آپ کھڑے ہیں وہاں جنت کی اپسرائیں بھی لبیک کہنے کو تیار بیٹھی ہونگی۔ یہ تو آپ کی نگاہ التفات ہے کہ میں آپ کو پسند آگئی۔

پھر اسے یاد آیا جب کبھی کسی بات پر دونوں میں تنازعہ ہو جاتا یاسمین اسے پسپا کر دیتی۔ عزت نفس کی خاطر وہ خاموش ہو جاتا ضبط کرتا۔ اس کی آنکھیں بھر آتیں۔ رامش کے آنسو دیکھ کر یاسمین کے چہرے پہ اک نوع کا سکون چھا جاتا اور وہ بستر پہ جاتے ہی بے خبر سو جاتی۔

آج بھی وہ رامش کے دل کو چھلنی کر کے خراٹے لے رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ طبی نقطۂ نگاہ سے خراٹے کی چاہے جو بھی وجہ ہو لیکن نفسیاتی اعتبار سے ایسے بوجھل ماحول میں لاشعور کی گنگی ہی ایسی بے فکری عطا کر سکتی ہے۔

رامش واش روم میں چلا گیا۔ واش روم کے آئینے میں خود کو دیکھتا رہا۔ خود کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ بہت ساری چیخیں ابھرنا چاہ رہی تھیں لیکن رامش ان چیخوں کو ہچکیوں کے حوالے کر کے آئینے سے کہنے لگا کیا میں اتنا برا دکھتا ہوں؟ میں تو فن کی خدمت میں کچھ اس طرح ڈوبا رہا کہ خود پہ کبھی غور ہی نہیں کر سکا۔۔۔ شہرت اور عزت کی خوشبو میں مہکتا رہا اور دولت کی کنجی یاسمین کے حوالے کر دی۔ شب وروز کے ہنگاموں میں سر کے بال کب جھڑنے لگے توجہ دینے کی مہلت ہی نہ ملی اور نہ ہی اپنے قد کی کوتاہی یا جلد کی سیاہی کا کبھی احساس ہوا جبکہ بھائی بہنوں نے اکثر یہی کہا کہ آپ کے نین نقش کتنے متناسب ہیں کتنے پرکشش ہیں!

تمہارے بھائی بہن صحیح کہتے ہیں۔

تو اس ناہنجار کو بتاؤ نا!

میں کیسے بتاؤں؟ میں تو انسان کی سوچ کا زائدہ ہوں۔ انسان مجھ میں جو دیکھنا چاہتا ہے وہی دکھلاتا ہوں۔ اپنی رائے کبھی نہیں دیتا اسی لئے تو اہم ہوں۔ مجھ پہ شک نہ کرو نہ ہی الزام دو جانتا ہوں تمہاری بیوی غلیظ اور کثیف ہے۔ بہترین روحوں کو آنسوؤں میں ڈبو کر قہقہے لگاتی ہے۔ اس کی نرگسیت سے خوف کھا کر خاموش رہتا ہوں۔

آئینہ اسکے چہرے پر بنتی مٹتی تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔

تم نہیں جانتے میری حالت! وہ پیارے پیارے بھائی بہن وہ علم وتہذیب کی منبع میری

ماں اور زاہد و عابد میرے ابوجن کی کفالت اور حفاظت کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے سرشار تھا میں- ان سب کی خوبیوں کا دلدادہ تھا لیکن جب سے یہ شاطرہ میری زندگی میں آئی سارے اچھے چہرے برے لگنے لگے-

میں جانتا ہوں کہ یہ شادی گو کہ تمہارے خواب کی تعبیر ہے لیکن تمہاری بیوی کے شاطرانہ منصوبوں کا مآل تھی آئینے کی باتیں رامش سنتا رہا- ان سچویشن کو تم نے امر پریم سمجھا ہوا تھا-

لیکن میں یاسمین سے بے انتہا محبت کرتا تھا-

یہ محبت ہے کیا بلا؟ آئینہ اسے آئینہ دکھانا چاہ رہا تھا کسی اندھے لنگڑے لولے اور بہرے سے کوئی شادی کیوں نہیں کرتا؟ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ لفظوں کے مفہوم عیاری کے کہرے میں دبکے رہتے ہیں- انہیں جو کھینچ کر روشنی میں لاتا ہے وہی رشتوں کی کثافت سے آشنا ہوتا ہے- تم نے اپنی داخلی طغیانی کو محبت سمجھ لیا تم جب کم نام تھے تو بہنوں کی شادی کروانا تمہارا اولین فریضہ تھا نامور ہوتے ہی دولت کی دیوی تمہارے قدموں پہ لوٹنے لگی۔۔۔ تم اپنی ذمہ داری نبھانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ اس بدذات نے جھٹ پٹ شادی کا ڈرامہ رچا دیا-

آئینے کی باتیں سن کر رامش کو حیرت ہوئی تم یہ سب کیسے جانتے ہو!؟ تم تو محض ایک آئینہ ہو۔۔۔ دیوار پہ لٹکنے والی ایک ضرورت- یہی تو تم انسانوں کی خوش گمانی ہے کہ خود کو اشرف سمجھتے ہو جبکہ اس صفت سے کوئی واسطہ ہی نہیں- ہم آئینے عالم آفرینش سے ہر جگہ موجود رہتے ہیں- کوئی راز ہم سے پوشیدہ نہیں- کیا تمہیں یاد نہیں کہ تمہاری بیوی کا بڑا بھائی جو پروفیشنل سوشل ورکر ہے اس نے تمہیں ہتھیانے کے لئے دو مہینے تک تمہارے گھر ڈیرا جمایا ہوا تھا۔۔۔ کہ اگر تم نے یاسمین سے شادی نہیں کی تو وہ زہر کھالے گی۔۔۔ تمہارے لئے رو رو کر بے حال ہو رہی ہے- اس وقت تک تم ایک نامور فنکار بن چکے تھے- یہ دونوں بھائی بہن مستقبل بیں تھے اور تم اپنی موجودہ حیثیت سے غافل ایک جذباتی انسان۔۔۔ ظاہر بات ہے ڈھے گئے۔۔۔ اور تمہارے خاندان کے سارے منصوبے سازش کی مٹی میں دفن ہو گئے! میں آئینہ ہوں خاموشی سے دیکھتا رہتا ہوں۔۔۔ مشورے نہیں دیتا کیونکہ عقلمند کو مشورے کی ضرورت نہیں اور بیوقوف مشورے لیتا نہیں- تم نے مشورے مانگے تو گویا ہوا۔

آج جب اس کا مکھوٹا اترا تو پچھلے واقعات تمہیں یاد آئینگے کہ منظر سے غائب رہ کر سب کچھ تم ہی سے کرواتی رہی- تمہاری بہنوں کی شادیاں ایسے لڑکوں سے کروائی ایسے خاندان میں کروائی کہ دونوں ہی بے وجود اور بے اثر لڑکے تھے- تم بیوقوف سمجھ نہ سکے کہ یہ ناگن تمہارے خاندان کا معیار گرائے جا رہی ہے- لیکن تمہاری بہنوں نے اپنے شوہر کا معیار بڑھا کر اسے شکست خوردہ بنا دیا-

تاریخ انسانیت ہم آئینوں کے سامنے ایسی کھلی ہے جیسے کسی کہنہ مشق استاد کے سامنے نصابی کتاب! آئینہ بولتا رہا' میں تمہاری بیوی کی دوہری شخصیت سے واقف ہوں- اس نے میرے سامنے ان سارے چہروں کی پریکٹس کی ہے جسے تم سب کے سامنے اسے ظاہر کرنا تھا- اور سینکڑوں بار مجھ پہ نظر گاڑ کے خود کلامی کی ہے- میں ہی اس کا ہمراز ہوں- تو بتاؤ نا اس کے بارے میں تاکہ میں خود کو اس سے بچا سکوں- رامش آئینے کو اس توجہ سے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی نیا مرید کسی پیر خمیدہ مرشد کے حضور دوزانو بیٹھ کر راز حیات کا درس لے رہا ہو-

تم نے اپنی بیوی کو جو سمجھا وہ تھی نہیں- اور اس نے تمہیں جو سمجھا تم وہی تھے- پانسہ اس کے اختیار میں تھا۔۔۔ ظاہر بات ہے جیت اسی کا مقدر تھی-

میں جیتنا نہیں چاہتا جینا چاہتا ہوں- میرے بچاؤ کا کوئی راستہ ہے تمہارے پاس؟ یا انسانوں کی طرح تم بھی غلط فہمی کے شکار ہو! میں ہاڑ ماس کی مخلوق نہیں کہ خود فریبی کے ہنڈولے پہ جھولتا رہوں- بصیر ہوں ۔۔۔ بصارت کے پرے جو کوئی آداب زندگی سے واقف ہونا چاہتا ہے اسی کی رہبری کرتا ہوں-

تو کرونا۔۔۔! رامش نے کہا جذبات کی قبر پہ مٹی ڈال کر جینے کا آرزومند ہوں۔

تو ہجرت کر جاؤ اس آتشی صحبت سے ذہنی ہجرت- آئینہ رامش کو آئینہ دکھانے لگا نا- یاسمین کی پرت پرت شخصیت سے روشناس کرانے لگا تم یاسمین کے لئے کچھ بھی کر لو۔۔۔ مفاہمت کے آسمان سے تارے لا کر دے دو خود کو بدل ڈالو تب بھی وہ مطمئن نہیں ہوگی کیونکہ تمہاری اہمیت سے واقف ہونا ہی نہیں چاہتی! اگر وہ تمہیں پہچان ہی نہیں پا رہی ہے تو سمجھ لو کہ وہ تمہارے لئے بنی ہی نہیں! وہ نرگسیت کی شکار ہے- اپنے فائدے کے لئے اس نے تمہیں ٹریپ کر لیا ہے- اس نے پریکٹس کر کے اس جال کو اتنا گنجلک بنا دیا ہے کہ اس جال سے باہر نکلنا ناممکن کی حد تک مشکل ہے-

آئینے کی باتیں سن کر رامش ٹرانس میں چلا جاتا ہے اور استحصال کے واقعات پر غور کرتا ہے- آئینہ کہتا ہے خود کو تمہارے سامنے مظلوم بنا کر پیش کرتی رہی- تم اس کی حفاظت پر معمور ہو گئے کہ وہ سسرال کی ستائی ہوئی عورت ہے- تمہارے خاندان کے افراد نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے اس کا ساتھ نہیں دیا جبکہ اس نے زبان کی حکمت عملی سے تمہیں تمہارے اپنوں سے بدظن کر دیا تاکہ اپنوں سے الگ کر کے تمہیں نگل سکے اور اس نے تمہیں نگل بھی لیا۔۔۔ اور تم اسے مظلوم سمجھ کر اپنوں سے بچانے میں جٹ گئے-

رامش آئینے کی شفاف باتیں سن رہا تھا- آئینہ بولتا رہا تمہاری بیوی نرگسیت کے معاملے میں ہائی فنکشننگ ہے اس کے ٹریپ سے نکلنا دشوار ہے- ایک ہی بات دہراتے رہو گے؟ رامش نے کہا دنیا بھر میں اپنی حکومت کا ڈنکا پیٹ رہے ہو لیکن میری جذباتی خستہ حالی پر بے عمل رہنماؤں جیسی لفاظی کئے جا رہے ہو- لفاظی کہہ کر میرے خون کو نہ کھولاؤ- تمہارے بھی خون ہیں!؟ رامش کے جھنجھلاہٹ بھرے قہقہے ابھرے- استعارے کی زبان میں کہہ رہا ہوں! یہ غلط فہمی دور کرو کہ زندہ صرف تم انسان ہی ہوتے ہو! سوری۔۔۔! تم زندہ ہو تو زندگی کا راستہ بتاؤ نا۔۔۔!

آئینہ گویا ہوا اپنا سب کچھ اپنے اختیار میں رکھو اپنی دولت۔۔۔ اپنے حواس۔۔۔ اپنا وجود۔۔۔ اور قوام بن جاؤ۔۔۔ قہقہے تمہارا استقبال کرینگے-

واش روم سے نکل کر رامش ڈرائنگ روم کا ایر کنڈیشن بند کرتا ہے اور کھڑکی دروازے کھول دیتا ہے بالکونی پہ کھڑے ہو کر سرسراتی ہواؤں کو سانسوں میں بھرتا ہے اور چھوٹے بھائی کے سرہانے بیٹھ کر اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں پہ کنگھی کرتا ہے-

طارق کی آنکھیں ندی بن جاتی ہیں۔۔۔!!

❑❑❑

التماس

”ماہنامہ نیادور“ کو ارسال کیے جانے والے مضامین اور تخلیقات کا معیاری ہونا ضروری ہے اور مسودات کمپوزشدہ، مکمل ایڈریس، موبائل نمبر اور تصویر کے ساتھ ہونا لازمی ہے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اشاعت ممکن نہیں ہوگی۔

ادارہ--

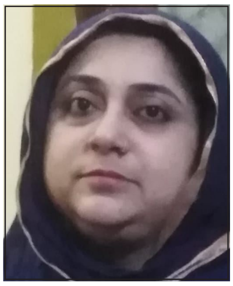

عطیہ حسن

احاطہ مرزا علی خاں، حسین آباد لکھنؤ

9335471201

راجِ نیستی گھر کی

الہ آباد کے ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھنے والی نازیہ چنچل، مست، بے باک انداز، ہر دل عزیز اور دوسروں کا درد دیکھ کر ساتھ دینے والی لڑکی تھی، جس کے والد نہایت شریف نیک انسان تھے اور سرکاری ملازم تھے۔ ماں بھی نہایت شریف تھی۔ نازیہ کی شادی لکھنؤ میں اچھے گھرانے میں طے ہوئی۔ شادی کے ہونے سے پہلے ماں کا انتقال ہو گیا۔ نازیہ رخصت ہو گئی باپ اور بھائی کے سائے میں۔ اس کو یہ سمجھانے والا کوئی نہیں تھا کہ سسرال میں غلط بھی ہو تو جواب نہ دینا، شاید ماں ہی یہ سمجھا سکتی تھی۔ دل میں ڈھیروں ارمان لیے ایک لمبا سفر طے کر کے نازیہ اپنے اصلی گھر آ گئی جیسا کہ بچپن میں ماں باپ کہتے ہیں تمہیں اپنے اصلی گھر جانا ہے، رسم و رواج کے چکا چوندھ، لوگوں کا خوشی سے ملنا، اب سب کچھ مل چکا تھا اسے۔ ولیمہ، چوتھی سب ٹھیک ٹھاک رہا۔ واپس چوتھی میں گئی تو ماں کی کمی کا احساس مارے ڈال رہا تھا۔ نازیہ نے بابا سے کہا کہ آپ بھی میرے ساتھ لکھنؤ چلیے اچھا لگے گا۔ آپ اور بھائی یہاں کیا کریں گے؟ بابا نہیں بیٹا بیٹیوں کے گھر نہیں جایا جاتا، نہیں رہا جاتا تم خوش رہو میں ٹھیک ہوں۔ نازیہ میں اپنے سسرال میں خوش تھی لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اکثر عورتیں کہتی تھیں کہ دکھاؤ اور کیا کیا لائی ہو؟ وغیرہ وغیرہ مگر کچھ تو خاندان کی عورتیں ایسی بھی تھیں جو میری ساس سے کہتی تھیں، ارے ثاقب کی امی اب تو بہو آ گئی کام والی، کھانا پکانے والی، سب رکھے ہو ہانڈی تو چھلا دی ہے اب بہو کو اس کی ذمہ داری بھی بتا دو ورنہ بعد میں اس کے دماغ خراب ہو جائیں گے۔ ساس کو بات سمجھ میں آنے بھی لگی تھی۔ دھیرے دھیرے رنگ بدلنا زندگی نے شروع کیا میرے سسر جو اونچی پوسٹ پہ تھے باہر رہا کرتے تھے وہ کبھی کبھی گھر پہ آتے تھے ان کو آنے پر پتہ چلا، بہو کام نہیں کرتی کام والے کا پیسہ فالتو جاتا ہے۔ سسر ساس سے بولے اتنے سالوں سے سات آٹھ لوگوں کا کھانا اور اتنا بڑا گھر تم نے تو دیکھا نہیں سب کام والوں پر ہی چل رہا ہے یہاں کا پورا انتظام۔ بیٹی ہے کسی کی سمجھا کرو جو جیسا چل رہا ہے چلنے دو۔ ایک چھوٹی سی نند جو نائنتھ میں پڑھ رہی تھی اس سے بے پناہ لگاؤ تھا مجھے شاید میری کوئی بہن نہیں تھی اس میں بہن دیکھ رہی تھی اچھی تھی وہ بھی مگر اپنا مطلب ہوتا تو سب میٹھی میٹھی ہوتی میرے دن گزرتے گئے۔ شوہر کی کسی کام میں مستقل مجازی نہیں تھی، سسر کے ساتھ زندگی کا دارومدار چل رہا تھا شوہر بھی بہترین خود دار محبت کرنے والا بس گرم مزاج تھا کہ اس کی وجہ سے اس کو سمجھ کوئی نہ سکا اسی لیے گھر میں ہمیشہ نقصان میں رہا۔ کسی نے اس کی سچائی کو دیکھنا نہیں چاہا، چھوٹے بھائی کو کسی کو ڈانٹ مار دیا تو اس کا اثر ہمیشہ پوری زندگی پر رہا۔ میں جب دلہن بن کر آئی تو ساس اور چھوٹے دیوروں نے سمجھایا کہ سنبھل کے رہیے گا مار پیٹ بھی غصے میں کرتے ہیں۔ ماں نے کہا دوسری لڑکیوں سے دور رکھنا وغیرہ وغیرہ خیر اور واقعی ایسا ہوتا بھی کہ ثاقب کب ناراض ہو جائیں سمجھ میں نہیں آتا تھا جب صفائی دیتی تو وہی گرما گرمی۔ حد تو یہ ہوتی کہ میری صحیح بات کہنے پر بھی راتوں رات میرے باپ کو فون کر کے پوچھا جاتا تھا، دو بجے رات میں کہ تربیت اتنی خراب کیوں کی ہے کہ وہ سوال جواب کرتی ہے اور بھائی کو بھی ذلیل کیا جاتا تھا خیر ایک وقت ایسا بھی آیا جب گھر والوں کے ساتھ شوہر نے بھی یقین کرنا چھوڑ دیا تھا حالانکہ اپنے گھر والوں کو ثاقب اچھی طرح جانتے تھے بعد میں سمجھ میں آیا جب میں چھ مہینے کے لیے بابا کے گھر چلی گئی یا کہیے کہ نکال دی گئی تھی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بوال مچا کر ساس بیٹوں کے سامنے برا ہی کہا کرتی تھی، نفرت بھرتی جا رہی تھی اور خود اکیلے میں وہ آ کے میری ماں کی دوائی دے کر مجھ سے معافی مانگ لیتی تھی میرا دل پگھل جاتا تھا ماں تھی ناہم بھی سب بھول کر آگے بڑھ جاتے تھے نہیں پتہ تھا کہ بیٹے نے جو پہلے ماں کو جواب دیا یا بھائیوں سے لڑائی ہوئی یا مارا پیٹا جو بھی تھا اس کی سزا ہمیں ملے گی۔ لوگ اتنی نفرت رکھیں گے میری زندگی ایک قیمتی لفافے میں پیک ایک روپے کی طرح تھی آگے کا حال نہیں بتا سکتے۔

> ”میرے شوہر پہ الزام تھا کہ صرف وہ لڑتا ہے مگر ایسا نہیں تھا بولا جاتا تھا اپنی ذمہ داری نہیں اٹھاتا تو ایسا بھی نہیں تھا کیونکہ گھر کی پوری ذمہ داری اور پیسہ چھوٹے والے دیور کے ہاتھ میں تھی بہرحال خالی منہ خالی ہاتھ ذمہ داری نہیں اٹھائی جا سکتی تھی لیکن سچ تو یہ تھا کہ بڑے بیٹے کو دوسروں کے گھر پڑھنے یا پلنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا بچپن سے جب کہ اپنے اور بچوں کو انہوں نے محبت بھی دی تھی اور شفقت بھی دی تھی ثاقب اس محبت اور شفقت سے محروم رہے ہمیشہ بیٹے کو بزنس کرانے کا وعدہ کر کے شادی کی گئی تھی میری شادی کے بعد کوئی دکان کھلا دیں گے۔ میری مجبوری ماں کو فالج ہو گیا تھا اور شادی سے پہلے انتقال بھی ہو گیا تھا ماں کا جیسے تیسے شوہر کے ساتھ دن گزرتا گیا کبھی نند کھانا چھپا رہی تو کبھی ساس اچھی بہو کی خاطر ناانصافی دکھانے میں کوئی موقع نہیں چھوڑتی تھی۔“

بابا کے گھر جانے سے پہلے اچھا برادونوں ماحول دیکھا سب کے ساتھ کبھی برا نہیں کیا مگر پھر بھی گندے سے گندے لفظوں میں نوازا گیا مگر حد تو تب ہوگئی جب مری ہوئی ماں کو بھی نہیں چھوڑا گیا اور باپ کو بھی بہت ہی گندے الفاظوں سے نوازا گیا جواب دینا تو لازمی تھا بیٹی تھی میں ان کی. پھر کیا تھا بس صرف مار نہیں کھایا وہاں پہ۔ دوسری بہو کی آمد ہوئی سب کو لگا لکشمی واقعی گھر آ گئی اور میں اور گرادی گئی پیسہ سسر کا غلہ سسر کا اسٹور میں سامان نہ رکھ کر اچھی بہو کے کمرے میں نئے اسٹور میں رکھا جانے لگا۔ کچن کا ہر سامان اور میں ہر صبح شام دروازہ کھٹکھٹا کے اچھی بہو سے شکر دے دو، ذرا پتی دے دو، دال، چاول، تیل غرض کہ ہر سامان اچھی بہو بیٹے کے دروازے سے ملنا شروع ہوگیا تھا۔ نند ساس کام والی سبھی انہی کے در سے وابستہ ہو گئے تھے۔ خیر اچھی بہو تھی سسر سے کہا تو بولے اچھی بہو ہے بیٹا ہے گھر گرستی والی ہے سب بجٹ بچا کے چلتی ہے، اور میرے شوہر پہ الزام تھا کہ صرف وہ لڑتا ہے مگر ایسا نہیں تھا بولا جاتا تھا، اپنی ذمہ داری نہیں اٹھاتا تو ایسا بھی نہیں تھا کیونکہ گھر کی پوری ذمہ داری اور پیسہ چھوٹے والے دیور کے ہاتھ میں تھا، بہر حال خالی منہ خالی ہاتھ ذمہ داری نہیں اٹھائی جا سکتی تھی لیکن سچ تو یہ تھا کہ بڑے بیٹے کو دوسروں کے گھر پڑھنے یا پلنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا بچپن سے جب کہ اپنے اور بچوں کو انہوں نے محبت بھی دی تھی اور شفقت بھی دی تھی۔ ثاقب اس محبت اور شفقت سے محروم رہے ہمیشہ بیٹے کو بزنس کرانے کا وعدہ کر کے شادی کی گئی تھی میری شادی کے بعد کوئی دکان کھلا دیں گے میری مجبوری۔ ماں کو فالج ہوگیا تھا اور شادی سے پہلے انتقال بھی ہوگیا تھا ماں کا جیسے تیسے شوہر کے ساتھ دن گزرتا گیا کبھی نند کھانا چھپا رہی، تو کبھی ساس اچھی بہو کی خاطر ناانصافی دکھانے میں کوئی موقع نہیں چھوڑتی تھی۔ اللہ پاک نے ایک بیٹا دیا جب سب خوش تھے دادا کے کہنے پر اس کی ہر ضرورت دادا کے پیسوں سے ہوتی تھی۔ دو سال کا ہونے پر اچھے بیٹے بہو نے اس کا دودھ بھی بند کر دیا اور دادا کو پتہ بھی نہیں چلا وہ باہر رہتے تھے دادی اور بیٹے بہو سب شامل تھے اس میں جبکہ دیور خود اپنے بچے دادا دادی کی کمائی سے پال رہے تھے دن گزرتا گیا شوہر پہلے بھی خود دار تھا میرا۔ اس نے اپنی ذمہ داری اٹھا رکھی تھی اللہ مدد کرنے والا ہے اور لوگ سوئی چبھاتے گئے اور ہم مدد کرتے گئے لوگوں کے ساتھ کھڑے رہے کوئی ہم سے 16 سال نہیں بولا کوئی 10 سال اور اچھا اچھی بہو بیٹے تو سب سے اچھے بنے رہے، بعد میں جڑ ہی کھود ڈالا یہ تو بعد میں پتہ چلا جب اللہ نے انہیں بھائیوں میں حقیقت کھولی اور باپ کے پیسوں کا راز کھلا جو اچھے بیٹے بہت تھے۔ باپ کی لمبی بیماری کے بعد انتقال ہوگیا، پھر کیا تھا باپ کی مٹی سے لے کر 40ویں تک کا سفر بھائیوں کی لڑائی میں گزرا نہ باپ کا علاج ہو پایا صحیح سے نہ 40واں مرحوم کے پیسے سے یہاں تک 40واں بھی بیٹوں کے چندہ دینے سے ہوا جس میں میرے شوہر کا بھی پیسہ تھا جو ہمیشہ برا ہی کہا گیا تھا جب کہ وہ اچھا انسان ہمیشہ رہا خدا کا شکر ہے گھر کے باہر ہم دونوں کو بے حد مانا چاہا اور عزت ملتی تھی ہر ایک کے درد میں کھڑے ہونا ہم لوگ لازمی سمجھتے تھے۔ بنا کسی بات کی لڑائی کا اثر یہ ہوا کہ سب اپنی اپنی کوٹھریوں میں ایک دن قید ہو گئے کوٹھری یعنی کہ سسرال سے ملا ہوا ایک ایک کمرہ، سب قید ہو گئے کسی نے کسی کو پوچھنا گوارا نہیں سمجھا اور ساس جسے صرف کیڑے نکالنے کی عادت تھی وہ میری دی ہوئی محبت عزت بنا غرض کی ہوئی خدمت اب سب لوگوں سے بیان کر رہی تھی ان کو بھی سمجھ میں آنے لگا تھا لیکن شاید دل کہیں سے پھٹ چکا تھا، کہتے ہیں نا شیشہ ایک بار ٹوٹ جاتا ہے تو جڑنے پہ درار رہتی ہے خیر دیور دیورانیاں نندیں جس نے بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے تھے میرے او پر ٹیک لگائے تھے آج باپ کے مرنے کے بعد اچھے بیٹے بہت سے ذمہ داری کا راز کھلنے کے بعد وہی حالات ان کے سامنے بھی آنے کے بعد سب کی آنکھیں کھل گئی تھی۔ آج سب نے کہہ دیا آپ لوگ صحیح تھے ہم لوگ غلط تھے مگر افسوس دنیا مطلبی لوگوں سے بھری پڑی ہے بس اتنا جانا اگر آپ صحیح ہو تو مکاری چالاکی دھوکے بازی کی دیوار بہت دن تک نہیں کھڑی رہ سکتی۔

❑❑❑

غزل

کر گئی ہے جو شاد شاد مجھے
آ گئی تھی خود اپنی یاد مجھے

قشقہ میری جبیں پہ کھینچ دیا
اُس نے جانا خوش اعتقاد مجھے

جاؤں گا تو گلے ملیں گے سبھی
وہ جو کرتے نہیں ہیں یاد مجھے

یادِ یاراں ہے تجھ سے دل آباد
تو سَدا رکھیو بامرآد مجھے

جانب دار ہیں قدم میرے
دوست کہتے ہیں خیر باد مجھے

داد بھی دوستوں کی ہے بیداد
اور یہ بیداد بھی ہے داد مجھے

تونے چھوڑا ہے ساتھ جانِ جنیدؔ
اک تجھی پر تھا اعتماد مجھے

جنیدؔ اکرم فاروقی
محلہ چلّہ، امروہہ
9259604319

نسرین فاطمہ
اقبال نگر، مفتی گنج لکھنؤ
9580638663

اتر پردیش صنعتی ترقیات سے روزگاری فروغ

آج اتر پردیش ملک کی سرکردہ معیشت کے طور پر آگے بڑھ رہا ہے۔ 10 سالوں میں کئے گئے کام کے نتیجہ میں ہندوستان نے خود کو دنیا کی پانچویں بڑی معیشت کے طور پر قائم کیا ہے۔ ریاست ملک کی ترقی کے انجن کے طور پر اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ آج ملک اور دنیا کے بڑے صنعت کار ریاست میں سرمایہ کاری کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ اس ماحول کو بنانے کے لیے ریاستی حکومت کو بہت سی اصلاحات کرنی پڑیں۔ لکھنؤ میں منعقدہ بزنس اسٹینڈرڈ سمردھی پروگرام میں وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ نے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ جب ہم معاشی خوشحالی کی بات کرتے ہیں تو کاروبار بھی اس کا حصہ ہے۔ شریمد بھگواد گیتا میں کاروبار کی تفصیل سے وضاحت کی گئی ہے۔ 'کرشی گورکشیا وانیجیام ویشیا کرم سوبھاواجم۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کھیتی باڑی، گائے کی حفاظت، اور تجارت ویشیوں کے کام کی خصوصیات ہیں۔ زراعت، گائے کی حفاظت اور معاشی سرگرمیاں وغیرہ کاروبار کے تحت آتی ہیں۔ بعد میں زراعت اور گائے کے تحفظ کو کاروبار سے الگ کر دیا گیا۔ آزاد ہندوستان میں تجارتی سرگرمیوں میں صرف وہی معاشی لین دین شامل ہوتا ہے جس میں سرمائے کی ایک بڑی بہت شامل ہوتی ہے۔ لیکن اگر تفصیل سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زراعت، مویشی پالنا اور ڈیری کا شعبہ اس سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اتر پردیش ملک کی سب سے زیادہ آبادی والی ریاست ہے۔ یہاں تقریباً 25 کروڑ کی آبادی رہتی ہے۔ وہ کیا وجہ تھی جو اتر پردیش کو ملک کی سرکردہ معیشت بننے سے روک رہی تھی؟ آج یہ ریاست میں سب سے سستی اور ہنرمند افرادی قوت ہے۔

کاشی اور پریاگ راج نے ملک کے بڑے تعلیمی مراکز کے طور پر بڑا کردار ادا کیا تھا۔ یہ کبھی مشرقی تعلیم کے مراکز تھے۔ دنیا کا سب سے قدیم گروکل، مہارشی بھردواج کا گروکل پریاگ راج میں واقع تھا۔ ہم وقت کے چکر کو نہیں سمجھ سکے۔ ہم نے وقت کی رفتار کو نہ پہچانا، نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کا مرکز، ہنرمند افرادی قوت، دنیا کی سب سے زرخیز زمین اور بہترین آبی وسائل ہونے کے باوجود ہم پیچھے رہ گئے۔ ساڑھے سات سال پہلے ریاست کے نوجوانوں، تاجروں اور کسانوں کو شناخت کے بحران کا سامنا تھا۔ ملک کا ہر بڑا تاجر اتر پردیش میں سرمایہ کاری کرنے میں ہچکچا رہا تھا۔ کاروبار کرنے اور معمول کی زندگی گزارنے کے لیے سلامتی اولین شرط ہے۔ تمام سرگرمیاں قانون کے مطابق ہوتی دیکھی جائیں۔ جس ریاست میں ہر دوسرے یا تیسرے دن فسادات ہو رہے ہوں، جس ریاست میں افراد کی حفاظت کی ضمانت نہ ہو، وہاں ان کے سرمائے کی حفاظت کی ضمانت کیسے دی جائے گی؟ اس وقت ریاست میں یہی ماحول تھا۔ پہلے ترقی کے لیے منصوبوں، پالیسیوں اور لینڈ بینک کا فقدان تھا۔ چناؤ اور انتخاب کے ذریعے امتیازی سلوک کیا گیا۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ریاستی حکومت نے سال 2017 میں ریاست کو آگے لے جانے اور ریاست میں سرمایہ کاری کو راغب کرنے کے لیے خیالات کو تیار کیا۔ دنیا کے مختلف ممالک میں روڈ شوز کا انعقاد کیا گیا۔

ریاست میں ہونے والی مثبت تبدیلیوں کو دیکھ کر صنعت کار یہاں سرمایہ کاری کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ خود سرمایہ کاروں سے بات کرنے ممبئی گئے جہاں 5.2 لاکھ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی تجاویز موصول ہوئیں۔ بالآخر ریاست کے پہلے سرمایہ کار اجلاس میں 04 لاکھ 59 ہزار کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی تجاویز موصول ہوئیں۔ اس کے بعد فروری 2023 میں یوپی گلوبل انویسٹرس سمٹ کا انعقاد کیا گیا۔ اس سرمایہ کار سمٹ میں 40 لاکھ کروڑ روپے سے زیادہ کی سرمایہ کاری کی تجاویز موصول ہوئیں۔ اس کے ذریعے 1 کروڑ 50 لاکھ سے زیادہ نوجوانوں کو روزگار فراہم کیا جا سکتا ہے۔ کاروبار میں سرمایہ کاری کے ذریعے بیک وقت ایک سے ڈیڑھ کروڑ لوگوں کو روزگار فراہم کرنا ممکن ہے۔ ریاست میں اس سمت میں بہترین قدم اٹھائے گئے ہیں۔ سرکاری شعبے میں ملازمتیں محدود ہیں۔ تاہم ریاست میں مختلف مراحل میں 1,54,000 پولیس اہلکاروں کو بھرتی کیا گیا۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ریاست میں صنعتی ترقی کی پہلی پالیسی کے تحت روزگار کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ہمیں سرمایہ کاری لانی ہوگی تاکہ ریاست کی صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ یہاں کے نوجوانوں کو روزگار سے جوڑا جا سکے۔ ریاستی حکومت نے 27 سیکٹرل پالیسیاں تیار کی ہیں۔ بہت سی پالیسیاں ہیں جو صرف اتر پردیش میں لاگو کی گئی ہیں۔ ریاست میں دفاع اور ایرو اسپیس، سیمی کنڈکٹر، لاجسٹکس، کمپریسڈ بائیو گیس وغیرہ سے متعلق پالیسیاں بھی بنائی گئی ہیں۔

اب ریاست FDI اور Fortune 500 پالیسی کے ساتھ ملک اور دنیا سے سرمایہ کاری کو راغب کرنے کے لیے کام کر رہی ہے۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ پہلے ریاست میں نہ بیٹیاں محفوظ تھیں اور نہ ہی تاجر۔ یہاں انتشار کا ماحول تھا۔ اس وقت اتر پردیش 20 سے 22 کروڑ کی آبادی والی ریاست تھی، لیکن سالانہ بجٹ صرف 02 لاکھ کروڑ روپے تھا۔ اونٹ کے منہ میں زیرہ کا کہاوت لفظی سچ ثابت ہو رہی تھی۔ آج ریاست کا بجٹ بڑھ کر تقریباً 5.7 لاکھ کروڑ روپے ہو گیا ہے۔ یہ ریاست کی خوشحالی اور معاشی ترقی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس وقت ریاست کی جی ڈی پی تقریباً 12 لاکھ کروڑ روپے تھی۔ آج یہ سال 2023-24 میں تقریباً 26 لاکھ کروڑ روپے تک بڑھ گیا ہے۔ مارچ 2025 تک ریاست کی جی ڈی پی 32 لاکھ کروڑ روپے تک پہنچنے کا اندازہ ہے۔

□□□

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ''کھیلے گا یوپی بڑھے گا یوپی'' کے تحت کھلاڑی کو مشعل دیتے ہوئے۔

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ خواتین کو کمبل تقسیم کرتے ہوئے۔

वर्ष : 78 अंक 5
सितम्बर, 2023
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए शिशिर, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा प्रकाश एन. भार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलेस, 3–सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक– **रेहान अब्बास**